دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۱ ماہ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۱۳ء عدد ۴

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

بیرک اوباما تبدیلی کے نعرے کے دوش پر قصرِ ابیض پہنچے تھے۔ اس کی وجہ سے امریکہ اور بیرونِ امریکہ بہت سے لوگ اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئے کہ ان کے انتخاب سے عالمی منظر نامہ میں دوررس اہمیت کی تبدیلیاں رونما ہوں گی اور دنیا پہلے سے کسی قدر ضرور بہتر ہو جائے گی۔ کچھ تو ان کے اپنے ذاتی پس منظر کی وجہ سے اور کچھ انتخابی مہم کے دوران اور صدارت کے ابتدائی دنوں میں ان کے بیانات کی وجہ سے یہ امید ہو چلی تھی کہ عالم اسلام کے ساتھ امریکہ کے تعلقات میں ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے جو باہمی احترام اور مشترکہ مفادات کی اساس پر استوار ہوگا۔ قاہرہ یونیورسٹی میں ۴؍جون ۲۰۰۹ کو انہوں نے جو تقریر کی تھی اس کا عنوان ہی ''ایک نئی ابتدا'' (A New Beginning) تھا۔ ایک ایسی ''ابتدا جس کی بنیاد اس سچائی پر ہو کہ امریکہ اور اسلام ایک دوسرے کو مسترد نہیں کرتے اور ان کے درمیان مسابقت کی فضا قائم ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ ان کے درمیان تمام انسانوں کے لیے انصاف اور ترقی، رواداری اور عزت نفس کے اصول مشترک ہیں''۔ بدقسمتی سے یہ ابتدا نقش برآب ثابت ہوئی۔ صدر اوباما کی پہلی میقات کے دوران امریکہ میں اسلاموفوبیا میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا۔ پادری ٹیری جونس اور اہانت رسولؐ پر مبنی فلم بنانے والوں نے وہاں اسلام دشمنی کے درجہ حرارت کو ناقابل برداشت حدود تک پہنچا دیا۔ گونتانا موبے کے تعذیب خانہ کو بند کرنے کے واضح اعلانات کے باوجود وہ اب بھی اسی طرح قائم ہے اور وہاں محبوس قیدی اسی طرح جسمانی، ذہنی اور روحانی اذیت سے دوچار ہیں۔ قرآن مجید کی بے حرمتی کی وجہ سے ان کی ایک بڑی تعداد فروری کی ابتدا سے بھوک ہڑتال پر ہے۔ ان سب پر مستزاد اسلامی ممالک کی فضاؤں میں دن رات منڈلاتا ہوا موت اور تباہی کا نقیب جسے ڈرون کا نام دیا گیا اور مخصوص مقاصد کے لیے جس کے استعمال میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا نے بالعموم اور عالم اسلام نے بالخصوص صدر اوباما کی قیادت میں امن و آشتی اور ایک بہتر زندگی کی جو امید کی تھی وہ دم توڑ چکی ہے۔ انہوں نے انتخابی مہم کے دوران اور صدارت کے ابتدائی دنوں میں جو کچھ کہا تھا اس کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اس سلسلہ میں اگر ان کے کچھ خیالات اور نظریات رہے بھی ہوں تو ہر کہ درکانِ نمک رفت نمک شد کے مصداق وہ ان سے دست بردار ہو چکے ہیں اور اس سلسلہ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ اس کا تازہ ثبوت اسرائیل اور فلسطین کا ان کا حالیہ دورہ ہے۔

مارچ کے آخری عشرے میں صدر اوباما نے اسرائیل اور فلسطین کا دورہ کیا۔ فلسطین کا دورہ تو محض خانہ پری کے لیے تھا، اس کا اصل فوکس اسرائیل تھا۔ دوسری میقات کے لیے ان کی انتخابی مہم میں اسرائیل کی ہمدردیاں

واضح طور پر فریق مخالف کے ساتھ تھیں، وزیر خارجہ جان کیری اور وزیر دفاع چک ہیگل کے تقرر کے سلسلہ میں صدر کو اسرائیلی لابی کی طرف جس شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا وہ ابھی بہت سے لوگوں کے ذہن میں تازہ ہوگی۔ان سب کے باوجود صدارت کی دوسری میقات کے بالکل ابتدائی دنوں میں ان کا اسرائیل کا دورہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کی ترجیحات میں اسرائیل کی غیر معمولی اہمیت کا غماز ہے۔ایک ایسے وقت میں جب اسرائیل میں ایک انتہا پسند دائیں بازو کی حکومت زیر تشکیل تھی یہ دورہ جہاں امریکہ اور اسرائیل کے مخصوص تعلقات میں مزید استحکام کا باعث بنا وہیں اسرائیل کی توسیع پسندی، مہم جوئی اور فلسطینیوں کے خلاف اس کی ظالمانہ پالیسیوں کو بھی سند جواز عطا کرنے کا ذریعہ بنا۔واقعہ یہ ہے کہ یہ وقت ایسے حساس خطہ کے دورے کے لیے مناسب نہیں تھا۔جس وقت اس دورے کے انتظامات آخری مراحل میں تھے فلسطین میں ظلم و جبر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا تھا اور معصوم نوعمر بچوں کو اسکول کے راستہ میں ان کے اسکول بیگ کے ساتھ گرفتار کیا جا رہا تھا۔حسب معمول اسرائیل کے بہادر فوجیوں پر ان معصوم بچوں کی آہ و بکا اور سسکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔اس واقعہ سے چند دن پہلے ہی اسرائیلی حکومت مغربی پٹی سے کاروبار اور مزدوری کے لیے اسرائیل جانے والے فلسطینیوں کے لیے ایک الگ بس سروس شروع کر چکی تھی۔ایسی نسلی تفریق کی اس وقت دنیا میں اور کوئی مثال نہیں ہے۔ان سب کے باوجود صدر اوباما نے جس صراحت سے صہیونیت کی توثیق کی ہے وہ ناقابل تصور ہے۔اسرائیل میں اپنی تقریر کے دوران انہوں نے کہا "The dream of true freedom found its expression in Zionist ideas"۔صہیونیت کو سچی آزادی کا مظہر قرار دینے کے لیے صرف اعلیٰ درجہ کی خطابت اور زور بیان ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے فلسطینیوں کے خلاف صہیونیوں کے ظلم و جبر کی طویل تاریخ کو یکسر نظر انداز کر دینے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہو۔یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ صدر نے صہیونیت کے نظریہ ساز تھیوڈور ہرزل کی قبر پر تو پھول چڑھائے لیکن یاسر عرفات کے سلسلہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔یروشلم میں بطور خاص اسرائیلی نوجوانوں کو خطاب کیا لیکن فلسطین کے نوجوانوں کو مخاطب کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔فلسطینی شدت پسندی کی مذمت کی لیکن ان عوامل کو یکسر نظر انداز کر دیا جو اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔گذشتہ دنوں میں فلسطینیوں کے درمیان پر امن احتجاج کا رجحان بڑھا ہے لیکن یہ پہلو بھی صدر کی توجہ سے محروم رہا۔انہیں حسب معمول اسرائیل کی سیکورٹی کی ضروریات اور اس کی اہمیت کا پورا احساس تھا چنانچہ اس کو یقینی بنانے کے لیے اسرائیل کے تمام تر ظالمانہ اقدامات کی بھرپور حمایت کی لیکن فلسطینیوں کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے کچھ کرنے کی اجازت نہیں۔فلسطینیوں سے انہوں نے تشدد کے راستہ کو چھوڑنے اور بلا شرط امن مذاکرات میں شامل ہونے کی خواہش کی لیکن ان کو یہ یاد نہیں رہا کہ گذشتہ چند برسوں میں

یہودی آبادکاروں کے ذریعہ زمینی حقائق میں کتنی تبدیلیاں لائی جاچکی ہیں۔انھوں نے فلسطینیوں کے حقوق اور غزہ کے بچوں کا بھی ذکر کیا اوراپنے سامعین کوان کی آنکھوں سے دنیا دیکھنے کی تلقین کی۔اگر وہ خودتھوڑی دیر کے لیے دنیا کوان کی آنکھوں سے دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے تو ان کواس اذیت، کرب، ذلت اور بے بسی اور کسمپرسی کا کسی قدر ادراک ضرور ہوجاتا جس سے فلسطین کے باشندے چھ دہوں سے گذر رہے ہیں اور جس نے ان کی زندگی کوایک مسلسل عذاب میں تبدیل کردیا ہے۔ایک مبصر کے بقول غزہ کے بچوں سے ہمدردی کا انھوں نے ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے تحت وہ اسرائیل کو فاسفورس بم اور ایف ۱۶ طیارے فراہم کرتے ہیں جو ان بچوں کے خلاف نہایت فراخ دلی سے استعمال کیے جاتے ہیں۔انھوں نے یہودی سیکورٹی کے زیرسایہ مسجد اقصیٰ کا بھی دورہ کیا جو یکسر غیر مناسب تھا۔واقعہ یہ ہے کہ اس دورے سے اسرائیلی انتہاپسندوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے ہیں۔چنانچہ اگلے چارسال تک فلسطینی املاک پرنئی یہودی بستیوں کی تعمیر کا سلسلہ امریکہ کی سرپرستی میں بلا روک ٹوک جاری رہے گا۔فلسطینیوں سے امریکی صدر کی توقعات کی فہرست تو بہت طویل ہے لیکن ان کو دینے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔

اسرائیل کی غیر مشروط حمایت کے علاوہ صدر اوباما کو اس دورے میں ایک بڑی کامیابی یہ ملی کہ ان کی موجودگی میں اسرائیلی وزیراعظم نے ماوی مارمرا کے حادثہ پر ''معذرت'' کی جسے ترک وزیراعظم نے قبول کرلیا۔ اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کا عمل شروع ہوگیا۔اسرائیل کے لیے ترکی کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اس کے لیے اسرائیلی حکومت پر ملک کے اندر بھی بڑا دباؤ تھا۔چنانچہ قریب دوسال سے دونوں حکومتوں کے درمیان ''معذرت'' کے متن پر مختلف سطحوں پر گفتگو ہوتی رہی تھی اور اس پر اتفاق رائے بھی ہوگیا تھا۔البتہ اس کے لیے اس موقع کا انتخاب معنی خیز ہے۔امریکہ کے لیے خاص طور سے یہ امر باعث اطمینان ہے کہ شرق اوسط میں اس کے دوقریبی حلیفوں کے درمیان صلح ہوگئی ہے۔خطہ کے لحہ لحہ بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔اس کے مکمل مضمرات تو وقت کے ساتھ ظاہر ہوں گے البتہ شام کے سیاق میں اس کی اہمیت واضح ہے۔گذشتہ چند برسوں سے ترکی حماس کا بڑا امدادگار رہا ہے۔اب بھی ترکی اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے جن دو مزید شرائط پر اصرار کرتا رہا ہے ان میں غزہ کے محاصرہ کا اختتام بھی شامل ہے۔غزہ کے باشندوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کے مقصد سے ترک وزیراعظم جلد ہی غزہ کے دورے کا منصوبہ بنارہے ہیں۔امید کی جانی چاہیے کہ غزہ کے لیے ترکی کی مدد پہلے ہی کی طرح جاری رہے گی اور خطہ میں ترکی کے قومی مفادات کو اس راہ میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔اگرچہ خود ترک اور فلسطینی مبصرین کے تجزیے اس سلسلہ میں بہت حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

مقالات

رسول اکرم ﷺ کا وقت وصال

جناب فیروز الدین احمد فریدی

علامہ شبلی کے انتقال کے ساڑھے پانچ سال بعد جب ۱۹۲۰ء کے وسط میں ان کی مرتب کردہ ''سیرت النبیؐ'' کی دوسری جلد شائع ہوئی تو اس کے ایک زیریں حاشیے میں سید سلیمان ندوی نے حیرت سے لکھا کہ ''کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی مجھ کو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی۔(۱)

تاریخ وفات کی حدیث تو نہیں مل سکی لیکن وقت وصال کی معروف حدیث موجود ہے اور ہے بھی رسول کریمؐ کے نوجوان ذاتی خادم حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے صحیح بخاری میں، لیکن کسی مشہور سیرت نگار نے اپنی کتاب میں وقت وصال نبویؐ کے لیے اس حدیث میں بیان کردہ وقت نہیں لکھا۔

رسول کریمؐ کے وقت وصال کے بارے میں چار مختلف روایات ہیں۔ آغاز حدیث کی روایت سے کرتے ہیں:

۱-آخر الیوم (دن کی آخری گھڑیاں): صحیح بخاری کی کتاب الاذان میں باب بعنوان ''اگر نمازی پر کوئی حادثہ واقع ہوجائے یا نمازی کوئی چیز دیکھے یا قبلے کی دیوار پر تھوک دیکھے''، میں حضرت انسؓ بن مالک سے مروی یہ حدیث ان الفاظ میں درج ہے:

وتوفی من آخر ذلک الیوم (۲)	اور اسی دن شام کو آپؐ نے وفات پائی۔(۳)	He died in the last hours of that day. (4)

کھتوال ہاؤس، 54-A، گلی نمبر ۱۵، باتھ آئی لینڈ، کراچی ۷۵۵۳۰۔

صحیح بخاری کی سب سے مشہور اور مستند شرح ''فتح الباری'' ہے جو حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی نے نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں کئی ضخیم جلدوں میں لکھی۔ وہ شعبان ۷۷۳ھ / فروری ۱۳۷۲ء میں پیدا ہوئے اور ذی الحجہ ۸۵۲ھ / فروری ۱۴۴۹ء میں وفات پا گئے۔ ۲۰۰۳ء میں دار الکتب العلمیہ بیروت نے اس ضخیم شرح کا جو جدید ایڈیشن کئی جلدوں میں شائع کیا، اس کی آٹھویں جلد میں ''وتوفی من آخر ذلک الیوم'' کی شرح ''کتاب الاذان'' کی بجائے ''کتاب المغازی'' میں درج ہے اور کتاب المغازی کا یہ باب نمبر ۸۴ رسول کریمؐ کی علالت اور وفات سے متعلق ہے اور اس کی حدیث کا نمبر ۴۴۴۸ ہے، جس میں ''وتوفی من آخر ذلک الیوم'' کا قول تو درج نہیں لیکن حدیث کے نیچے اس قول کی تشریح ان الفاظ میں درج ہے:

قولہ (وتوفی من آخر ذلک الیوم) یخدش فی جزم ابن اسحاق بانہ مات حین اشتد الضحی، ویجمع بینھما بان اطلاق الآخر بمعنی ابتداء الدخول فی اول النصف الثانی من النھار وذلک عند الزوال،واشتداد الضحی یقع قبل الزوال ویستمر حتی یتحقق زوال الشمس، وقد جزم موسی بن عقبۃ عن ابن شھاب بانہ ﷺ مات حین زاغت الشمس، وکذا لابی الاسود عن عروۃ، فھذا یؤیدا الجمع الذی اشرت الیہ (۵)

حضرت انس بن مالک نے کہا: (آنحضرتؐ اس دن کے آخر میں وفات پا گئے) حضرت انس بن مالک کا یہ قول ابن اسحاق کی وثوق سے بیان کردہ اس بات کو مشکوک بنا دیتا ہے کہ آپؐ کی وفات دن چڑھے ہوئی۔ ان دونوں باتوں میں مطابقت یوں کی جا سکتی ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ نے (اپنے قول میں) ''آخر'' کا لفظ دن کے دوسرے آدھے حصے میں سورج کے داخل ہونے کے لیے استعمال کیا اور یہ زوال آفتاب کے قریب ہوتا ہے، جبکہ سورج کی انتہائی روشنی اور حدت زوال آفتاب سے پہلے وقوع پذیر ہوتی ہے اور زوال آفتاب تک جاری رہتی ہے اور موسیٰ بن عقبہ نے بھی ابن شہاب کی روایت سے یہ بات وثوق سے کہی ہے کہ آپؐ نے زوال

آفتاب کے قریب وفات پائی اورالابی اسود نے
عروہ سے یہی روایت کی ، لہٰذا اجتماعی تائید وہی
ہے جس کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے۔

فتح الباری کی مندرجہ بالا حدیث (نمبر ۴۴۴۸) کا عربی متن (اور ترجمے) اردو اور انگریزی تراجم میں مندرجہ ذیل مقامات پر رقم ہے اور دونوں کتابوں میں حدیث کے متن میں اس قول کا ذکر نہیں:

۱-اردو ترجمہ (مترجم علامہ وحیدالزماں): صحیح بخاری شریف (مترجم) جلد دوئم صفحہ ۷٦۵، حدیث نمبر:۱۵٦۴ کتاب المغازی باب مرض النبی ووفاتہ، ناشر: مکتبہ رحمانیہ لاہور، سال اشاعت ۱۹۹۹ء۔

۲-انگریزی ترجمہ (مترجم ڈاکٹر محمد محسن خان): The translation of the meanings of Sahih Al-Bukhari (Vol:V) page:520 Kitabul Maghazi chapter: The sickness of the Prophet and his death Hadith No:729, Publisher: Kazi Publications, Ganpat Road, Lahore, Year of Publication: 1979.

فتح الباری کے بیروت اڈیشن (۲۰۰۳ء) میں اس قول کی شرح وہاں کیوں طبع ہوئی، جہاں اس کے اوپر درج شدہ حدیث میں وقت وصال نبویؐ کے قول کا ذکر نہیں، یہ اس مضمون کا موضوع نہیں، اس پر محدثین کی توجہ چاہیے۔ فتح الباری کی یہ شرح اس مضمون میں درج کرنے کا مقصد قاری کی توجہ فتح الباری کی شرح کے ان آخری الفاظ پر دلانا ہے:

''اور ابن شہاب (زہری) سے موسیٰ بن عقبہ نے بہت وثوق سے
روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ کا وصال ''زاغت الشمس''، یعنی زوال آفتاب کے
وقت ہوا اور یہی روایت ابوالاسود نے عروہ بن زبیرؓ سے کی ہے''۔

مندرجہ بالا الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس تحریر کے آخری صفحات میں ہو جائے گا۔

۲ سہ پہر: سیرت النبیؐ (جلد دویم) میں علامہ شبلی نے آپؐ کی وفات کا وقت ''سہ پہر'' (٦)

لکھا ہے، جس کی سند میں انہوں نے اسی صفحے پر یہ زیریں حاشیہ لکھا ہے:

''ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ وفات دوپہر کو ہوئی، لیکن حضرت انسؓ بن مالک سے بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آخر یوم یعنی دوشنبہ (پیر) کے آخر وقت وفات پائی۔ حافظ ابن حجر نے دو روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ دوپہر ڈھل چکی تھی اور سہ پہر کا وقت تھا''۔(٦)

حافظ ابن حجر کی شرح کا عربی متن اور رواں ترجمہ درج کیا جا چکا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ وفات دوپہر کو ہوئی۔ یہ مکمل طور پر درست نہیں۔ ابن اسحاق نے ''اشتد الضحی'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''الضحی'' کے مختلف معانی پر اگلے صفحات میں تفصیلی بات کی گئی ہے۔ فی الحال اتنا لکھنا کافی ہے کہ ''اشتد الضحی'' کے معنی زیادہ تر ''دن چڑھے'' کیے گئے ہیں۔

ثانیاً علامہ شبلی نے وقت وصال نبویؐ ''سہ پہر'' بتایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''سہ پہر'' کے کیا معنی یا مطلب ہے؟

''سہ'' اور ''پہر'' دونوں فارسی زبان کے الفاظ ہیں۔ فارسی زبان میں لفظ ''سہ'' بہت سے فارسی الفاظ کے پہلے استعمال ہوا ہے، لیکن ''سہ پہر'' کا مرکب لفظ مروج اور مستند ''فارسی۔ انگریزی'' یا ''فارسی۔ اردو'' لغات میں نظر نہیں آتا۔ سہ پہر کا لفظ اردو بول چال میں عام استعمال ہوتا ہے لیکن اردو کی قدیم معیاری لغت ''فرہنگ آصفیہ'' میں بھی نظر نہیں آتا، تاہم ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والی ''اردو لغت بورڈ'' کراچی کی اردو لغت (تاریخی اصول پر) کی بارہویں جلد کے صفحہ ۲۴۲ پر اس کے معنی یہ دیے گئے ہیں: دوپہر کے بعد اور شام سے پہلے کا وقت ماہ جون میں یہ دورانیہ دوپہر بارہ بجے کے بعد سے چھ بجے تک ہوسکتا ہے۔ یہ ایک خاصا لمبا دورانیہ ہے اور وقت وصال نبوی کے لیے سہ پہر کا لفظ پڑھ کر ایک عام قاری کے ذہن میں یہ خیال آنا عین ممکن ہے کہ ۸/ جون (۶۳۲ء) کے طویل اور گرم دن رسول کریمؐ کا وصال نماز عصر کے لگ بھگ ہوا ہوگا۔ عام قاری کی بات چھوڑیں، کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۶۲ء میں پی ایچ ڈی کے ڈگری یافتہ ایک عربی داں عالم نے تحریر کیا ہے کہ آپؐ کا وصال عصر کے بعد ہوا۔ سہ پہر کے اس تاثر کو زائل

کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ نہ اس کی کوئی سند ہے اور نہ ہی حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں جو تطبیق دی ہے، اس کے معنی یا مطلب عصر کے بعد ہو سکتے ہیں، آپؐ کے بارے میں قیاس آرائیوں سے گریز کرنا چاہیے۔

III-اشتد الضحاء (زوال آفتاب سے پہلے؟): یہ روایت عربی، اردو اور انگریزی کی مختلف کتابوں میں ان الفاظ میں درج ہیں:

۱-السیرۃ النبویہ (۷) از ابن ہشام (عربی متن): ''اشتد الضحا'' سند نہیں دی

//-سیرت النبی (۸) از ابن ہشام (عربی سے اردو ترجمہ): چاشت کا وقت خاصا ہوگیا۔ سند نہیں دی

۲-رحمۃ للعالمینؐ (۹) از قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری: ''چاشت''۔ صحرۃ النہار تاریخ ابوالفداء

۳-رسول کریمؐ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات (۱۰) از مولانا ابوالکلام آزاد: ''چاشت''۔ نہیں دی

۴-الرحیق المختوم از صفی الرحمٰن مبارک پوری (عربی متن) (۱۱): ''اشتدت الضحی''۔ ایضاً

//-الرحیق المختوم از صفی الرحمٰن مبارک پوری (اردو ترجمہ) (۱۲): ''چاشت کی شدت کا وقت''۔ ایضاً

//-الرحیق المختوم از صفی الرحمٰن مبارک پوری (انگریزی ترجمہ) (۱۳): "High Morning Time"۔ ایضاً

۵-The Life of Muhammad (عربی سے انگریزی ترجمہ) (۱۴): "Heat of Noon"۔ ایضاً

IV-زاغت الشمس (زوال آفتاب کے بعد): یہ روایت عربی اور اردو کی مختلف کتابوں میں ان الفاظ میں درج ہے:

۱-[۱۵] مغازی رسول اللہؐ لعروہ بن الزبیر (بروایت ابی الاسود اعنہ) (عربی متن) (یعنی حضرت عروہ بن زبیر کی روایت جو (یتیم عروہ) ابی الاسود نے کی: ''زاغت الشمس'')۔ سند حضرت عروہ بن زبیر

۲-ایضاً (ابن شہاب (الزہری) کی روایت جو موسیٰ بن عقبہ نے کی (۱۵): ''زاغت الشمس''۔ ابن شہاب الزہری

۳-کتاب المغازی (۱۶) از محمد بن عمر بن واقدی (عربی متن): ''زاغت الشّمس''۔ نہیں دی

۴-طبقات الکبیر (۱۷) از محمد بن سعد (عربی متن): ''زاغت الشّمس''۔ ایضاً

//-طبقات ابن سعد (۱۸) از محمد بن سعد (عربی سے اردو ترجمہ): ''آفتاب ڈھل چکا ایضاً تھا''۔

۵-نبی رحمتؐ (۱۹) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: ''زوال کے بعد''☆۔ ایضاً

☆ زیریں حاشیے میں مولانا ندوی نے لکھا ہے کہ ''بعض روایت میں ضحیٰ اور ضحوہ آتا ہے، جو چاشت کا وقت ہے''۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا نے اس کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ ایک روایت میں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، ایک روایت ''آخر الیوم'' کی بھی ہے۔

اب تک جو لکھا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ زاغت الشّمس کی روایت پہلی صدی ہجری میں، اشتد الضحا کی روایت دوسری صدی ہجری میں، آخر الیوم کی روایت تیسری صدی ہجری میں اور سہ پہر کی روایت چودھویں صدی ہجری / بیسویں صدی ہجری میں ضبط تحریر میں آئیں۔

ذیل میں پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری کی روایات کا مختصر جائزہ، مختصر تبصروں کے ساتھ پیش ہے۔

پہلی صدی ہجری: رسول کریمؐ کے وقت وصال کی سب سے پہلی روایت جو ضبط تحریر میں آئی، وہ زاغت الشّمس یعنی زوال آفتاب کے بعد کا وقت ہے۔ یہ روایت حضرت عروہ بن زبیر بن العوامؓ (۲۲ھ-۹۴ھ) سے منسوب ہے۔ وہ حضرت زبیر اور حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے چھوٹے بیٹے اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا سال وفات ۵۸ھ (۲۰) بتایا جاتا ہے۔ اس طرح حضرت عروہ کی پیدائش اور حضرت عائشہؓ کی وفات کے درمیان ۳۶ سال کا لمبا وقفہ ہے۔ حضرت عروہ نے حضرت عائشہؓ سے سن کر بہت سی احادیث جمع کرلیں۔ انہوں نے اپنے والدین حضرت علیؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی احادیث روایت کی ہیں۔ (۲۱)

حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت اسماءؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ رسول کریمؐ کا وصال کس وقت ہوا۔ اس قابل احترام خاندانی پس منظر کے علاوہ حضرت عروہؓ کا شمار نہ صرف مدینے کے سات عظیم فقہاء میں ہوتا تھا بلکہ وہ ایک عظیم محدث بھی مانے جاتے تھے

(۲۲) ان سے منسوب روایت زاغت الشّمس کا تفصیلی ذکر اگلے صفحات میں ہے۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے وسط: اس دور کے تین مشہور سیرت نگاروں کے نام یہ ہیں: ۱- عبداللہ بن شہاب الزہری (۵۰ھ-۱۲۴ھ)، ۲- موسیٰ بن عقبہ (۵۵ھ-۱۴۱ھ)، ۳- محمد بن اسحاق (۸۵ھ-۱۵۱ھ)۔

دوسری صدی ہجری: اس دور کے دو مشہور سیرت نگار یہ ہیں: ۱- محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ھ-۲۰۷ھ)، ۲- ابن ہشام (نامعلوم-۲۱۳ھ)۔

عبداللہ بن شہاب الزہری اپنی علمیت کی وجہ سے اس لقب سے مشہور تھے، جس کا مترادف اردو میں علامہ ہوگا۔ وہ حضرت عروہؓ بن زبیر کے عزیز شاگرد، اور ان ہی کی طرح ایک عظیم محدث بھی تھے۔ الزہری نے حضرت عروہ بن زبیرؓ سے بہت سی احادیث کی روایت کی ہے۔ رسول اکرمؐ کے مغازی پر ان کی کتاب پہلی صدی ہجری کے اختتام پر لکھی گئی، جو اب ناپید ہے۔ (۲۳)

موسی بن عقبہ اور محمد بن اسحاق (ابن اسحاق) دونوں عبداللہ بن شہاب الزہری کے شاگردان رشید تھے۔ موسی بن عقبہ نے سیرۃ رسول اللہؐ کے لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی کتابوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ یہ کتابیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے غلام موسی بن عقبہ کے پاس رکھوا دی گئی تھیں (۲۴)۔ موسی بن عقبہ نے آخری عمر میں کتاب المغازی تصنیف کی، جو دراصل ان کے استاد عبداللہ بن شہاب زہری کی کتاب المغازی کا مثنی ہے، جس کو انہوں نے آخری عمر میں مزید تحقیق کے بعد مرتب و مدون کیا ہے (۲۵)۔ ایک قول کے مطابق "زہری سے روایت کی ہوئی، موسی بن عقبہ کی کتاب مغازی کی سب سے صحیح کتاب ہے (۲۶)۔ موسی بن عقبہ کی "مغازی" بھی اب ناپید ہے۔ اس کے اقتباسات بعض مستند کتابوں میں ملتے ہیں۔ موسی بن عقبہ کی مغازی کو امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے فقہاء اور فتح الباری کے مولف حافظ ابن حجر جیسے علماء نے بہت اہمیت دی ہے (۲۷)۔ امام مالکؒ نے ان کی مغازی کو "اصح المغازی" کہا اور یہی بات سات صدیوں بعد حافظ ابن حجر نے دہرائی (۲۸)۔ ان کی مغازی کے اقتباسات کو محققین جن میں مغربی مستشرقین بھی شامل ہیں، آج بھی بہت اہمیت دیتے ہیں، چنانچہ ۱۹۵۵ء میں جب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے The Life of Muhammad شائع کی تو ایڈیٹر الفرڈ گیوم

نے اپنے ابتدائی نوٹ کے صفحات نمبر ۴۳ سے ۴۷ تک موسی بن عقبہ کی گمشدہ کتاب کے انیس اقتباسات کا انگریزی ترجمہ شامل کیا۔(۲۹)

موسی بن عقبہ کی طرح الزہری کے دوسرے شاگرد محمد بن اسحاق نے رسول کریمؐ کی سوانح حیات لکھی ۔ یہ آپؐ کی پہلی مفصل سوانح حیات ہے، جس میں الزہری کے حوالے سے کئی روایات درج ہیں۔ تاریخ میں ابن اسحاق کا بہت بڑا نام ہے لیکن علم حدیث میں وہ حضرت عروہ بن زبیر اور اپنے استاذ زہری کا مقام نہ پاسکے۔

ابن اسحاق کی کتاب کا پورا نام ''کتاب المبتداء والمبعث والمغازی'' ہے۔ پیدائش کے تقریباً تیس سال بعد تک وہ مدینے میں رہائش پذیر رہے اور اس دوران میں بہت محنت، محبت اور یکسوئی سے آپؐ کے بارے میں ہر ممکنہ ماخذ سے مواد جمع کرتے رہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی ضخیم کتاب تیس سال کی عمر میں مدینے میں مکمل کر لی تھی، لیکن ایسا ہونا مشکل نظر آتا ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے کتاب کا ابتدائی یا اس کا بڑا حصہ مدینہ چھوڑنے سے پہلے لکھ لیا ہو۔ مدینے سے وہ تیس سال کی عمر میں سکندریہ (مصر) آئے اور اگلے بیس سال مصر، ایران اور عراق میں گذارے، جہاں انہوں نے مختلف اوقات میں، مختلف شاگردوں کو، جن کی تعداد چودہ تھی، اپنی کتاب کا املا کرایا۔ ان چودہ شاگردوں میں جس شاگرد کا خصوصی مقام ہے، ان کا نام زیاد بن عبداللہ بکائی ہے۔

ایک قول کے مطابق ''سیرت نبویؐ سے بکائی کے عشق اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حصول کے لیے اپنا گھر بار فروخت کر کے ابن اسحاق کے ساتھ ہو لیے اور ان سے مغازی کی سماعت مکمل کر لی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی سماع کردہ روایت کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کے لیے (ابن اسحاق سے) اس کی دوبارہ سماعت کی۔ اسی وجہ سے ان (بکائی) کی روایت کو سیرت ابن اسحاق کی دوسری روایتوں پر فوقیت حاصل ہے''۔

ابن اسحاق کی یہ کتاب آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھی۔ اس دوران میں اس کی شرحیں لکھی گئیں، خلاصے مرتب ہوئے۔ حتی کہ اسے منظوم بھی کیا گیا۔ پھر یہ کتاب ایسے غائب ہوئی (جس کی وجہ آگے درج ہے) کہ آج اس کا کوئی ایک ایسا نسخہ موجود نہیں جو بیک وقت مستند

اور مکمل ہو۔

ابن اسحاق کی کتاب کی اشاعت کے تقریباً نصف صدی بعد، ابن ہشام نے ان کی کتاب کو بہت محنت سے ایڈٹ کیا اور درج ذیل وجوہات کی بنا پر، ایڈیٹنگ کے دوران، ابن اسحاق کی کتاب کے بعض حصوں کو کتاب سے خارج کر دیا:

۱- ان کے مضامین کا رسول کریمؐ کی حیات اور سیرت سے براہ راست تعلق نہیں تھا۔ ۲- ان سے کسی مسئلے کی تشریح نہیں ہوتی تھی۔ ۳- ان کا ذکر لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن سکتا تھا۔ ۴- وہ اشعار جو یا تو مستند نہیں تھے، یا مستند تو تھے لیکن ہجو اور فحش کلامی پر مبنی تھے۔

اس ایڈیٹنگ کے بعد ابن ہشام نے ابن اسحاق کے متن کے کئی حصوں پر حواشی اور تعلیقات لکھیں۔ اب لوگوں کو ابن اسحاق کی ضخیم کتاب کا ایک ایڈٹ کیا ہوا، تلخیص شدہ اور اضافہ شدہ ایڈیشن دستیاب ہو گیا، جس کا نام ابن ہشام نے ''السیرۃ النبویہؐ'' رکھا اور ابن اسحاق کی کتاب کے منظر سے غائب ہونے کی بڑی وجہ یہی ہو سکتی ہے۔ ۱۹۳۷ء/۱۳۵۵ھ میں ''السیرۃ النبویہ'' کا جدید ایڈیشن چار جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوا، جسے مصطفیٰ السقا، ابراہیم البیاری اور عبدالحفیظ شبلی نے مرتب کیا تھا۔ ایک انگریز مستشرق الفرڈ گیوم نے قاہرہ ایڈیشن کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۵۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن نے اسے The Life of Muhammad کے عنوان سے شائع کیا۔ انگریزی ترجمے کے سرورق پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ابن اسحاق کی ''سیرت رسول اللہؐ'' کا ترجمہ ہے، جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ صرف ایک حد تک یہ بات درست ہے جس کی تشریح ذیل میں درج ہے:

انگریز مترجم نے ابن ہشام کی السیرۃ النبویہ کو ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہؐ بنانے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ ابن ہشام نے ادبی دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے السیرۃ النبویہؐ میں جن باتوں کا اضافہ، فقرے کے آغاز پر، اپنا نام لکھ کر کیا تھا، الفرڈ گیوم نے انہیں السیرۃ النبویہؐ کے متن سے نکال کر، ترجمے کے آخر میں ضمیمے کے طور پر درج کر دیے اور سر آغاز میں لکھ دیا کہ یہ اضافے ابن ہشام کے ہیں۔ ان کی تعداد ۹۲۲ بنتی ہے۔ اس کے بعد السیرۃ النبویہ کے متن کا جو حصہ باقی بچا، اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اسے ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہ کا نام دے دیا

(گوابن اسحاق نے اس نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی تھی) کیونکہ اس بقیہ متن کا کلی انحصار اس املا پر تھا جو زیاد بکائی نے دوبار، ابن اسحاق سے لی تھی اور یوں انگریزی ترجمے کا متن ابن اسحاق کا ہے، ابن ہشام کا نہیں۔

The Life of Muhammad کے صفحہ ۶۸۲ پر آپؐ کے وصال کا وقت ان الفاظ میں درج ہے:

"The apostle died with the heat of noon that day".(۳۰)

ابن ہشام کی السیرۃ النبویہ میں اس موضوع پر درج شدہ متعلقہ عربی متن (جو ابن اسحاق کا ہے) یہ ہے:

"فتوفی رسول الله صلی الله علیه وسلم حین اشتد الضحاء من ذلک الیوم"۔(۳۱)

چودہویں صدی ہجری / بیسویں صدی عیسوی میں مولانا غلام رسول مہر اور عبدالجلیل صدیقی نے مندرجہ بالا عربی فقرے کا ترجمہ "سیرت النبیؐ" (حصہ دوئم) میں ان الفاظ میں کیا:(۳۲)

"پھر اسی دن جب چاشت کا وقت خاصا ہو گیا، تو آپؐ کی وفات ہوگئ"۔

معلوم ہوا کہ چودہویں صدی ہجری / بیسویں صدی عیسوی میں وقت وصال نبویؐ کے جو معروف انگریزی اور اردو تراجم رقم بند ہوئے، ان میں مترجمین کے سامنے ابن ہشام کا ایڈٹ کیا ہوا وہی عربی متن تھا، جو اوپر درج ہے(۳۲)، اشتد الضحاء کا ترجمہ انگریزی میں "Heat of Noon" اور اردو میں "چاشت کا وقت خاصا ہو گیا" کیا گیا۔

اب واقدی کا ذکر باقی رہتا ہے۔ انہوں نے دوسری صدی ہجری کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے آغاز میں، اپنی ضخیم کتاب المغازی لکھی تو وقت وصال نبویؐ کو ان الفاظ میں بیان کیا:(۳۳)

"فتوفی رسول الله صلی الله علیه وسلم حین زاغت الشمس"	رسول اللہؐ نے زوال آفتاب کے بعد وفات پائی۔

اس طرح پہلی صدی ہجری کے اختتام پر وقت وصال نبویؐ کے بارے میں صرف ایک

روایت ''زاغت الشّمس'' تھی اور دوسری صدی ہجری کے اختتام پر دو روایات ''زاغت الشّمس'' اور ''اشتد الضحاء'' تھیں۔

تیسری صدی ہجری: تیسری صدی ہجری کی تالیفات میں سے صرف دو کتب کے اقتباسات پیش ہیں: ۱- طبقات الکبیر از محمد بن سعد (۱۶۸ھ- ۲۳۰ھ)، ۲- صحیح بخاری از امام محمد بن اسماعیل بخاری (۱۹۴ھ-۲۵۶ھ)۔

طبقات الکبیر: اگرچہ محمد بن سعد کو ''کاتب واقدی'' کے لقب سے پکارا جاتا ہے لیکن ان کی روایات اپنے استاد واقدی سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ وقت وصال نبویؐ کے بارے میں استاد اور شاگرد کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ محمد بن سعد نے اپنی ضخیم تر کتاب ''طبقات الکبیر'' میں اس موضوع پر لکھا:

"وهو يموت فتوفی صلی الله عليه صلاة يحبها و يرضاها حين زاغت الشمس ......" ۔(۳۴)

بیسویں صدی عیسوی میں عبداللہ العمادی نے اپنے اردو ترجمے بعنوان ''طبقات ابن سعد'' نیں اس فقرے کا یہ ترجمہ کیا:

''......جبکہ آفتاب ڈھل چکا تھا، آپؐ کی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالی نے آپؐ پر ایسی رحمت نازل کرے جس سے آپؐ خوش ہوں اور جسے آپؐ پسند کریں''۔(۳۵)

۲-صحیح بخاری: تیسری صدی ہجری میں جب محدثین کی توجہ احادیث جمع کرنے کی بجائے صحیح احادیث کا انتخاب کرنے پر مرکوز ہوئی تو صرف نصف صدی کے دوران یکے بعد دیگرے احادیث کے چھ مجموعے مرتب ہوئے، جو آج تک ''صحاح ستہ'' یعنی چھ صحیح ترین مجموعہ ہائے حدیث کے نام سے معروف ہیں۔ ان میں صحیح بخاری نہ صرف سب سے پہلے شائع ہوئی بلکہ ان چھ صحیح ترین کتابوں میں صحیح ترین قرار پائی۔ صحیح بخاری میں وقت وصال نبویؐ "**آخـــر ذلک اليوم**" (۲) بتایا گیا، جو دوسری صدی ہجری میں ابن اسحاق اور ابن ہشام نے "**اشتد الضحا من ذلک اليوم**" (۷) لکھا تھا۔ **آخر ذلک اليوم** کا مطلب اس دن کا آخر ہوا اور اس کے راوی رسول کریمؐ کے ذاتی نو جوان خادم حضرت انس بن مالکؓ ہیں۔

صحیح بخاری کی بارہ صدیوں سے قائم مسلمہ اہمیت کے پیش نظر اگلے صفحات میں صحیح بخاری سے چار احادیث کا عربی متن، ان کے انگریزی اور اردو ترجمے کے ساتھ پیش ہے۔ آغاز آخر ذلک الیوم والی حدیث سے کیا جاتا ہے:

The Translation of the Meaning of Sahih Al-Bukhari (Vol-I), Pages: 402-403, Hadith No: 721, Translator: Dr.M.Mohsin Khan.

۱۔عربی متن (صفحہ ۴۰۲-۴۰۳) "اخبرنی انس قال : وتوفی من آخر ذلک الیوم" ۔(۲)

۲-انگریزی ترجمہ (صفحہ ۴۰۲) "Narrated Anas ..... He died in the last hours of that day".۔(۴)

۳-اردو ترجمہ "انس بن مالک نے خبر دی کہ اسی دن شام کو آپؐ نے وفات پائی" ۔(۳)
اردو ترجمے کا ماخذ: صحیح بخاری شریف (مترجم) ج ۱، ص ۳۸۱، حدیث ۷۱۷، مترجم علامہ وحید الزماں۔

تیسری صدی ہجری کے وسط میں مرتب ہونے والی صحیح بخاری کی آخر الیوم والی مندرجہ بالا روایت نہ تو پہلی صدی ہجری میں حضرت عائشہؓ کے بھانجے، حضرت اسماءؓ کے بیٹے، حضرت علیؓ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے اور مدینے کے سات ممتاز ترین فقہاء میں شمار ہونے والے حضرت عروہ بن زبیرؒ کی روایت کے مطابق ہے، نہ دوسری صدی ہجری میں زہری، ابن اسحاق، واقدی اور ابن ہشام کے، نہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ابن سعد کے اور نہ چودھویں صدی ہجری / بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند کے چار مشہور سیرت نگاروں علامہ شبلی / سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری اور سید ابوالحسن علی ندوی کے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان چار جید سیرت نگاروں نے "آخر الیوم" کو نظر انداز کر کے اور اس کے بجائے دن کے اوقات بیان کر کے روز روشن کی طرح واضح کر دیا کہ وہ آخر الیوم کی روایت کے بارے میں کیا رکھتے ہیں۔ اس فہرست میں ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں۔

اب انتخاب دو قدیم روایات اشتد الضحاء اور زاغت الشمس کے درمیان رہ جاتا ہے

اوران کے معانی جاننے کے لیے قرآن اور حدیث سے بہتر سند کہاں سے مل سکتی ہے؟

اشتد الضحاء: پہلے اشتد الضحاء کو لیں یہ دو الفاظ ''اشتد'' اور ''الضحاء'' پر مشتمل ہے۔ اشتدت کا لفظ قرآن میں صرف ایک جگہ یعنی سورہ ابراہیم (نمبر۱۴) کی آیت ۱۸ میں ہے۔اس کے معنی تیزی، سختی، زور یا شدت ہیں۔الضحاء کا لفظ قرآن میں تین مقامات پر یعنی سورہ اعراف (نمبر۷)، سورہ طٰہٰ (نمبر۲۰) اور سورہ الضحیٰ (نمبر۹۳) میں آیا ہے،اس لفظ کے دس اردو ترجمے اور پانچ انگریزی ترجمے جو مشہور مترجمین نے بیسویں صدی میں کیے ہیں، نیچے درج ہیں:

نمبرشمار، مترجم	سورہ اعراف	سورہ طٰہٰ	سورہ الضحیٰ
اردو تراجم	(سورہ۷-آیت ۹۸)	(سورہ۲۰-آیت ۵۹)	(سورہ۹۳-آیت:۱)
۱-مولانا اشرف علی تھانوی	دوپہر	دن چڑھے	دن کی روشنی
۲-مولانا ابوالکلام آزاد	دن دہاڑے	دن چڑھے	ترجمہ نہیں دیا
۳-ڈپٹی نذیر احمد	دن دہاڑے	دن چڑھے	چاشت
۴-مولانا امین احسن اصلاحی	دن دہاڑے	چاشت	چاشت
۵-سید قطب شہید	دن کے وقت	دن چڑھے	روز روشن
۶-مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	دن کے وقت	دن چڑھے	روز روشن
۷-مفتی محمد شفیع	دن چڑھے	دن چڑھے	دھوپ چڑھتے وقت
۸-مولانا احمد رضا خان بریلوی	دن چڑھے	دن چڑھے	چاشت☆
(تفسیر میں)	---	---	☆(تفسیر میں درج ہے کہ ''بعض مفسرین نے فرمایا کہ دن مراد ہے''
۹-مولانا فتح محمد جالندھری	دن چڑھے	چاشت	آفتاب کی روشنی
۱۰-مولانا عبدالماجد دریابادی	دن چڑھے	دن چڑھے	دن کی روشنی
انگریزی تراجم			
۱۱-مولانا عبدالماجد دریابادی			
(انگریزی ترجمہ)	Day light	Forenoon	Morning Brightness

۱۲-آر ہبری	Day light	High Noon	White Forenoon
۱۳-عبداللہ یوسف علی	Broad Day light	Sun is well up	Glorious Morning
۱۴-محمد اسد	Broad Day light	Sun is risen high	Bright Morning Hours
۱۵-پکتھال	Day time	Sun has risen high	Morning Hours

مندرجہ بالا تراجم میں ''ضحیٰ'' کے معنی زیادہ تر ''دن چڑھے'' کیے گئے ہیں، چند تراجم میں اس کا ترجمہ ''چاشت'' کیا گیا ہے اور بعض ترجموں میں اس کے معانی ''دوپہر'' اور ''دن دہاڑے'' بھی درج ہیں۔ اس سے واضح ہوگیا کہ عربی کے بہت سے الفاظ کی طرح لفظ ''ضحیٰ'' کے بھی واحد متعین معنی نہیں۔ انگریزی تراجم ہوں یا اردو ترجمے، سورہ اعراف، سوہ طٰہٰ اور سورہ الضحیٰ میں اس لفظ کے ترجمے پر نظر ڈال لیں تو کسی مترجم کا ترجمہ بھی تینوں سورتوں میں یکساں الفاظ میں نہیں ہے۔ گو اکثر اوقات ان مختلف الفاظ کا مفہوم مختلف نہیں، لیکن بعض اوقات مفہوم بھی مختلف ہے اور یاد رہے کہ ان تراجم کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن کہیں بعد کے ترجمے میں تبدیلی یا حاشیے میں وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اگر ترجمے میں غلطی ہوتی تو بعد کے اڈیشنوں میں اس کی تصحیح یا وضاحت کردی جاتی۔

ضحیٰ کا ترجمہ اگر انگریزی تراجم میں کہیں Forenoon اور کہیں High Noon کیا گیا تو اردو تراجم میں ایک ہی مترجم یعنی مولانا اشرف علی تھانوی نے جن کی قرآن فہمی، علمیت اور ثقاہت مسلم ہے، ضحیٰ کا ترجمہ سورہ اعراف میں ''دوپہر''، سورہ طٰہٰ میں ''دن چڑھے'' اور سورۃ الضحیٰ میں ''دن کی روشنی'' کیا۔ دن چڑھے کو ایک پہر تو کہا جاسکتا ہے لیکن دوپہر نہیں۔ یہ مترجم کا سہو نہیں بلکہ لفظ ضحیٰ کے معانی کی وسعت ہے، جس میں دن اور دوپہر بھی شامل ہیں اور دن چڑھے کا وقت بھی۔

یہ تو ضحیٰ کے معنی ہوگئے لیکن جب ضحیٰ سے پہلے اشتد کا لفظ بھی لگا ہو اور وصال کا وقت ''اشتد الضحاء'' بتایا گیا ہو تو ''اشتد'' کا لفظ یا تو دوپہر کی شدت کو ظاہر کرتا ہے یا دن کی سختی کو جو ''دن چڑھے'' کے وقت نہیں ہوسکتی۔

یہاں ایک اور اہم نکتے کا ذکر ہوجائے۔ زاغت الشّمس کی روایت کا آغاز پہلی صدی

ہجری میں حضرت عروہ بن زبیرؓ سے ہوا۔ ان کے دو مشہور شاگرد ابوالاسود اور زہری تھے۔ ابوالاسود نے حضرت عروہ بن زبیرؓ سے زاغت الشّمس کی روایت کی۔ زہری نے حضرت عروہ بن زبیرؓ سے زاغت الشّمس کی روایت نہیں کی، بلکہ زہری نے اپنے طور پر زاغت الشّمس کی روایت کی ہے۔ اگر حضرت عروہ بن زبیر نے اپنے ایک شاگرد (ابوالاسود) سے یہ روایت کی تو دوسرے شاگرد رشید (زہری) سے کیوں نہیں کی؟ اگر محققین کسی ایسی مصدقہ تحریری روایت کا پتہ چلا لیں تو حضرت عروہ بن زبیرؓ، ابن شہاب زہری اور موسیٰ بن عقبہ کے درمیان مسلسل روایت کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جائے گا۔

اب اسی طرح آگے چلتے ہیں۔ علامہ زہری کے دو مشہور ترین شاگرد موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق تھے۔ موسیٰ بن عقبہ نے اپنے استاد سے زاغت الشّمس کی ہی روایت کی جس کا حوالہ حافظ ابن حجر نے نویں صدی ہجری میں فتح الباری میں دیا۔ علامہ زہری کے دوسرے مشہور شاگرد ابن اسحاق نے علامہ زہری یا کسی اور ہستی کا حوالہ دیے بغیر بلا سند اشتد الضحاء کے الفاظ استعمال کیے، کیوں؟

اب قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ زاغت الشّمس کے لیے تو تین نسلوں پر مشتمل روایات ہیں اور راویان بھی پہلی صدی ہجری کے حضرت عروہ بن زبیرؓ اور پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے وسط کے عبداللہ بن شہاب الزہری اور موسیٰ بن عقبہ ہیں۔ ابن اسحاق یا ابن ہشام کی روایت اشتد الضحا کی سند کیا ہے؟ اس سند کا ذکر نہ The Life of Muhammad میں ہے نہ السیرۃ النبویہ میں۔ وقت وصال نبویؐ کوئی ایسی غیر اہم بات تو نہ تھی کہ رسول کریمؐ کے وصال کے ڈیڑھ سو سال بعد، آپؐ کی پہلی مفصل سوانح حیات میں آپؐ سے بے پناہ محبت رکھنے والے ایک مسلمان مورخ کے قلم سے بلا سند اور بلا تحقیق لکھ دی جاتی جبکہ سند اور تحقیق دونوں کے لیے ابن اسحاق کے اپنے استاد اور مدینے کے سات فقہاء میں سے ایک عظیم فقیہ اور عظیم محدث عبداللہ بن شہاب الزہری موجود تھے۔ جب کسی کے انتقال کا ذکر ہوتا تو انتقال کے سال کا تو کبھی ذکر نہیں ہوتا (یہ ذکر مورخین کرتے ہیں، بات چیت میں نہیں ہوتا)، اسی طرح انتقال کے مہینے کا بھی بات چیت میں شاذ و نادر ذکر ہوتا ہے لیکن انتقال کے وقت کا اکثر ذکر ہوتا ہے، یہ کیسے ممکن

ہے کہ ۱۱ھ اور اس کے بعد آپؐ کے عزیزوں اور صحابہ نے اس کا ذکر نہ کیا ہو؟

اگر عبداللہ بن شہاب الزہری نے اپنے شاگرد ابن اسحاق سے زاغت الشّمس کی روایت اسی طرح بیان نہیں کی، جیسے حضرت عروہ بن زبیرؓ نے اپنے شاگرد رشید عبداللہ بن شہاب الزہری سے مبینہ طور پر بیان نہیں کی، تو رسول کریمؐ کی پہلی اور ضخیم سوانح حیات لکھتے وقت ابن اسحاق کو یہ اہم بات علامہ زہری سے پوچھ لینے میں کیا امر مانع تھا؟ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اگر علامہ زہری نے اپنے ذی قدر استاد حضرت عروہ بن زبیرؓ سے مبینہ طور پر زاغت الشّمس کی روایت نہیں کی۔ تب بھی علامہ زہری نے اپنے طور پر وہی روایت (زاغت الشّمس) کی، جو ان کے استاد نے کی تھی۔ ابن اسحاق نے تو اپنے استاد کی روایت کو برقرار رکھنے کی بجائے ایک نئی روایت (اشتد الضحاء) کردی، جو بلاسند ہے۔ یہ کیوں ہوا جبکہ وہ نہ صرف اپنے استاد بلکہ اپنے ہم عصر موسیٰ بن عقبہ سے پوچھ سکتے تھے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن شہاب الزہری اور موسیٰ بن عقبہ تینوں ''صاحب المغازی'' ہیں۔ حضرت عروہ، حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے اور ان کی پیدائش آپؐ کی وفات کے تقریباً دس سال بعد ہوئی۔ کیا ہم ان کی بات مانیں یا ابن اسحاق / ابن ہشام کی بلاسند روایت؟ اب لفظ چاشت پر غور کرلیا جائے، جو بیسویں صدی عیسوی میں قرآن کے بعض اردو تراجم اور چند کتب ہائے سیرت میں درج ہے۔

چاشت فارسی زبان کا لفظ ہے۔ طہران سے شائع شدہ ایک جدید اور مستند فارسی - انگریزی لغت میں جس کا فارسی نام ''فرہنگ فارسی انگلیسی نوین'' (۳۶) ہے، چاشت کے یہ معانی دیے گئے ہیں:

۱- First of day (فارسی میں: اول روز)

۲- Morning Time (فارسی میں: ہنگام صبح)

۳- Middle hours of forenoon (فارسی میں: صبحانہ)

فارسی زبان سے یہ لفظ اردو میں داخل ہوا۔ اردو معانی بتانے کے لیے دو مستند لغات کا انتخاب کیا گیا ہے، ایک قدیم اور ایک جدید۔ قدیم لغت (۱۹۰۸ء) فرہنگ آصفیہ ہے اور جدید لغت (۱۹۸۶ء) اردو لغت بورڈ کراچی ''اردو لغت'' (تاریخی اصول پر) ہے۔ فرہنگ آصفیہ (۳۷)

جلد دویم میں صفحہ ۹۲ پر چاشت کے معانی یہ دیے گئے ہیں:

(i) پہر دن چڑھے کا وقت ۔(ii) چوتھائی دن گزرنے کا وقت ۔(iii) سورج نکلنے اور دوپہر کے درمیان کا وقت ۔

''اردو لغت'' (تاریخی اصول پر) (۳۸) جلد ہفتم میں صفحہ ۲۷۶ پر چاشت کے معانی یہ دیے گئے ہیں:

(i) پہر دن چڑھے کا وقت جب کہ آفتاب بلند ہوتا ہے، تقریباً نو بجے ۔(ii) طلوع اور دوپہر کے وسط کی ساعت ۔

جب الرحیق المختوم کے عربی متن میں اشتدت الضحیٰ، اس کے اردو ترجمے میں چاشت کی شدت کے وقت اور اس کے انگریزی ترجمے میں High Morning Time کے الفاظ استعمال کیے گئے اور ماخذ کا ذکر نہیں کیا گیا، تو ان کا ماخذ درحقیقت ابن ہشام کی السیرۃ النبویہ تھی،، جس میں اشتد الضحاء کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے، اشتد الضحاء اور اشتدت الضحیٰ کے حروف میں معمولی فرق ہے لیکن معنی میں نہیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور قاضی سلیمان سلمان منصور پوری دونوں نے اپنی کتابوں میں وقت وصال نبویؐ کے لیے شدت کا ذکر کیے بغیر، صرف چاشت کا لفظ لکھا۔ ظاہر ہے کہ ان فاضل سیرت نگاروں کا ماخذ ابن ہشام نہیں ہو سکتے ۔ اگر ابن ہشام نہیں تو پھر کون ہے یا ہیں؟ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں، اس لیے اس پر تبصرہ نہیں ہوسکتا ۔ مولانا سلیمان سلمان منصور پوری نے متعلقہ صفحے کے زیریں حاشیے میں سند کے طور پر صرف اتنا لکھا ہے ''ضحوۃ النہار، تاریخ ابوالفداء'' (۳۹)، جس سے اکیسویں صدی عیسوی کے قاری کو مطلوبہ وضاحت حاصل کرنے میں مدد نہیں ملتی ۔ مولانا غلام رسول مہر/عبدالجلیل صدیقی نے ابن ہشام کی السیرۃ النبویہ کا اردو ترجمہ کرتے وقت ''اشتد الضحاء'' کا ترجمہ چاشت کے خاصے وقت سے کیا، جو صفی الرحمٰن مبارکپوری کے ترجمے چاشت کی شدت کے وقت سے ملتا جلتا ہے ۔ اس بارے میں سب سے حیرت ناک اور افسوس بات یہ ہے کہ جب لاہور کے ایک خاصے جانے پہچانے اشاعتی ادارے ''ادارۂ ثقافت اسلامیہ'' نے ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کی ترتیب و تحقیق شدہ مغازی رسول اللہ لعروۃ بن الزبیر (جس کا ذکر پچھلی سطور میں ہو چکا ہے) کا اردو میں ترجمہ

کرانے کے لیے اس اشاعتی ادارے کے اپنے الفاظ میں ''پاکستان کے ممتاز عالم مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی'' کا انتخاب کیا، تو ان ممتاز عالم نے حضرت عروہ بن زبیرؓ کی مغازی میں وقت وصال نبویؐ کے لیے درج شدہ الفاظ زاغت الشّمس کا ترجمہ زوال آفتاب کے بعد کرنے کی بجائے، اس کے الٹ ''طلوع شمس کے بعد'' (۴۰) کر دیا۔ اس ترجمے کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تو ۱۹۹۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا (۴۰)۔ یہ اس بدیہی اور بنیادی غلطی کو دور کرنے کا بہترین موقع تھا، حیرت اور افسوس ہے کہ غلط ترجمہ برقرار رہا۔ گذشتہ ربع صدی کے دوران میں جن ہزاروں اردو داں قاریوں نے اس ترجمے کو ایک حوالے کی مستند کتاب سمجھ کر پڑھا ہوگا، وہ آج تک یہ سمجھتے ہوں گے کہ اللہ کے آخری رسولؐ کا وصال طلوع شمس کے بعد ہوا اور یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سلیمان سلمان منصور پوری جیسے جید علماء نے جب وقت وصال نبویؐ کے لیے چاشت کا لفظ استعمال کیا، تو قاری سمجھے گا کہ اس کی سند حضرت عائشہؓ کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیرؓ ہیں۔ اب زاغت الشّمس پر غور فرمایے۔

(II) زاغت الشّمس: ۱۹۸۱ء/۱۴۰۱ھ میں، ریاض (سعودی عرب) سے ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی نے طویل تحقیق اور تقابل کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے (۱۵): ''**مغازی رسول اللہؐ لعروۃ بن الزبیر بروایت ابی الاسود اعنه (النسخة المستخرجة)**'' عام فہم زبان میں، اسے رسول کریمؐ کے غزوات اور سیرت پر پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ کتاب تو ہو ہی نہیں سکتی جو تیرہ سو سال پہلے حضرت عروہ نے اپنے ہاتھ سے لکھی یا اپنی زبان سے املا کرائی تھی لیکن یہ اس مخطوطے کی بعینہٖ نقل بھی نہیں ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے حضرت عروہ سے منسوب مغازی کے مختلف حصوں کو بعد کے زمانوں کے مستند مخطوطوں میں درج شدہ عبارات سے چھان پھٹک کر نکال کر اور ان استخراج شدہ عبارات کا دوسرے قدیم مستند مخطوطوں سے مقابلہ کرنے، نیز ان کی تصدیق کرنے کے بعد انہیں اپنی ایڈٹ کی ہوئی کتاب میں درج کر دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شکستہ تاریخی مینار کے مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے پتھر، ایک ایک کر کے احتیاط سے چنے جائیں، ایک جگہ جمع کیے جائیں اور پھر ٹوٹے ہوئے پتھروں کو جوڑ جوڑ کر اور صحیح سالم پتھروں کو ان کی اصلی

حالت میں ایک ایک کر کے اٹھا کر، گرے ہوئے مینار کو، ممکنہ حد تک، اس کی اصلی حالت میں کھڑا کر دیا جائے۔

اس بات کی وضاحت ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کے اپنے الفاظ میں پڑھیے، درج ذیل یہ دو اقتباسات اس طویل مقدمے کا حصہ ہیں جو ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے اس کتاب کے آغاز میں لکھا ہے:

(۱) پہلا اقتباس: حضرت عروہ کے بعد جو (بھی) آیا، وہ نہ صرف آپ کی اس کتاب (مغازی) سے بلکہ دوسری کتابوں سے بھی متاثر ہوا۔ ان میں امام ابن شہاب الزہری اور موسی بن عقبہ کے نام بڑے اہم ہیں ...... (تاہم) ہمارے لیے جو چیز بڑی اہم ہے وہ ہے ''مغازی موسی بن عقبہ'' کی مناسبت ''مغازی عروہ بروایت ابی الاسود'' سے۔ بحث کرنے والے حضرات اور محدثین نے مغازی موسی بن عقبہ کی بہت تعریف کی ہے اور اس کے اقتباسات (بہت سی) کتب میں موجود ہیں...... ہم نے چھان پھٹک کی تو یہ بات سامنے آئی کہ موسی بن عقبہ کا اعتماد الزہری پر ہے ...... یہ درحقیقت عروہ پر اعتماد ہے کیونکہ الزہری کا مصدر و منبع وہی (عروہ) ہیں۔ موسی بن عقبہ کی نصوص کا جب ہم مغازی عروہ بروایت ابی الاسود سے مقارنہ (؟) کرتے ہیں تو عجیب اتفاقات نظر آتے ہیں اور یہ اتفاقات فقرہ دو فقرے، صفحہ دو صفحے کے نہیں بلکہ دسیوں صفحات پر مشتمل ہیں (۴۱)۔ {پہلا اقتباس ختم ہوا جس کے ترجمے میں ''مقارنہ'' کی بجائے ''مقابلہ'' ہوسکتا ہے}۔

دسیوں صفحات پر مشتمل ان عجیب اتفاقات کو ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے کئی کئی صفحات پر مشتمل دو مثالیں ان دو عنوانات کے تحت دی ہیں، جن میں فقرہ دو فقرے، صفحہ دو صفحے نہیں بلکہ کئی کئی صفحات پر مغازی عروہ بروایت ابی الاسود کے الفاظ مغازی موسی بن عقبہ میں دہرائے گئے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

۱- شعب بنو ہاشم میں بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کا دخول (۴۲)۔ ۲- (رسول کریمؐ کی پھوپھی) عاتکہ کا (غزوۂ بدر کے متعلق) خواب۔ (۴۳)

(۲) دوسرا اقتباس: میں (ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی) نے مختلف مصادر سے ''ابن لہیعہ عن

ابی الاسود عن عروہ'' کی روایات جمع کیں اور ابتداء میں کوشش کی کہ محض اس سند سے روایات جمع کروں اور اس کتاب کا ستر فیصد مواد ان ہی اسناد سے جمع ہوا ہے ۔ پھر...... میں نے ایسی روایات دیکھیں جو حضرت عروہ کے علاوہ موسی بن عقبہ نے بھی ذکر کی ہیں ۔ ان دو روایات کے بعد جو روایات آئیں، ان کو ان کی روشنی میں جمع و مرتب کیا یا صرف موسی بن عقبہ کی روایت ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ ابوالاسود نے بھی (حضرت عروہ کی روایت کا) اسی انداز سے ذکر کیا ہے ۔ (۴۴) {دوسرا اقتباس ختم ہوا}

یہ ہے وہ انداز فکر اور طرز تحریر جس کے مطابق ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے اپنی عربی کتاب کے صفحہ ۲۲۲ پر، یہ تاریخی فقرہ ''مرض موت رسول اللہؐ'' کے زیر عنوان درج کیا، جس میں ان کا آغاز اور انحصار دونوں موسی بن عقبہ پر ہیں:

''**وقال الحافظ : وقدجزم موسی بن عقبة عن ابن شهاب بانه صلی الله علیه وسلم مات حین زاغت الشمس و کذا لابی الاسود عن عروة**۔ (فتح الباری، ۸:۱۴۴ وانظر ایضاً، ۸:۱۴۶) (۴۵)	اور حافظ (ابن حجر) نے کہا: ابن شہاب (زہری) سے موسی بن عقبہ نے بہت وثوق سے روایت کی کہ آنحضرتؐ کا وصال ''زاغت الشمس'' کے وقت ہوا اور یہی روایت ابوالاسود نے عروہ (بن زبیر) سے کی۔

(ماخذ: (حافظ ابن حجر کی) فتح الباری (جلد نمبر) ۸، صفحہ ۱۴۴ اور (جلد نمبر) ۸، صفحہ ۱۴۶) اس تحریر کے ابتدائی صفحات میں ہم نے لکھا تھا کہ ''مندرجہ بالا الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس تحریر کے آخری صفحات میں ہو جائے گا''، امید ہے کہ اب یہ اندازہ ہو گیا ہوگا ۔ یہاں یہ اضافہ بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہی وہ اجتماعی تائید ہے جس کی طرف اب سے چھ سو سال پہلے حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ لکھ کر مندرجہ بالا فقرے کو ختم کیا تھا: ''**فهذا یؤید الجمع الذی اشرت الیه**'' (لہٰذا اجتماعی تائید وہی ہے جس کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے)۔

اس فقرے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت حضرت عروہ بن زبیر سے شروع ہوئی، ان سے ان کے لے پالک شاگرد ''یتیم عروہ'' ابوالاسود نے روایت کی، جس کا تحریری ثبوت موجود ہے ۔ اس کے بعد یہی بات علامہ ابن شہاب زہری سے موسی بن عقبہ نے بہت وثوق سے

روایت کی اور اس کا بھی تحریری ثبوت موجود ہے۔ دراصل موسی بن عقبہ کی کتاب المغازی ان کے شیخ ابن شہاب زہری کی کتاب المغازی کا مثنی ہے، جسے انہوں (موسی بن عقبہ) نے آخری عمر میں مزید تحقیق وتلاش کے بعد، مرتب و مدون کیا۔ اگر موسی بن عقبہ کی کتاب علامہ زہری کی کتاب کا مثنیٰ ہے اور موسی بن عقبہ کی کتاب میں مغازی عروہ بروایت ابی الاسود کے دسیوں صفحات بھی لفظ بہ لفظ نظر آتے ہیں تو معلوم ہوا کہ مخرج ومنبع ومصدر حضرت عروہ بن زبیر ہیں، جن کی مغازی کی روایت دوسروں کے علاوہ ابی الاسود نے بھی کی۔

یہاں ابو الاسود اور حضرت عروہؓ بن زبیر کے باہمی تعلق کا بھی مختصر ذکر ہوجائے۔ ابوالاسود کے والد ۷۳ھ کی جنگ میں حضرت عبداللہ بنؓ زبیر کی طرف سے شریک تھے اور اسی جنگ میں کام آگئے۔ ان کے والد نے اپنی موت سے پہلے اپنے اس بچے کو جس کا نام محمد تھا، حضرت عروؓہ کی کفالت میں دینے کی وصیت کی، حضرت عروہؓ نے اس وصیت کی ایسی پاسداری کی کہ محمد ''یتیم عروہ'' کی نسبت سے مشہور ہوگئے۔ اس گہری رفاقت اور قربت کی وجہ سے یتیم عروہ نے حضرت عروہؓ سے ان کی کتاب المغازی کا علم حاصل کیا اور بعد میں مصر میں جا کر اس کی روایت اس طرح کی کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق حضرت عروؓہ کی المغازی کا نام ''کتاب عروہ عن طریق ابی الاسود'' پڑ گیا اور اسے بہت سے محدثین نے نقل کیا۔ حافظ ابنؒ حجر کی مثال اوپر دی جاچکی ہے۔

زاغت الشمّس کی روایت رسول کریمؐ کے وصال کا وقت نہ گھنٹوں، منٹوں اور سیکنڈوں میں بتاتی ہے اور نہ بتاسکتی تھی، لیکن جہاں اشتد الضحا میں وقت دوپہر ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا، وہاں زاغت الشمّس میں یہ وقت صرف زوال آفتاب کے بعد کا ہوسکتا ہے۔ اس کے معنی اور مفہوم مندرجہ ذیل اسناد سے واضح ہوجائیں گے۔

ایڈورڈ ولیم لین کی ''عربی - انگریزی لغت''، ۱۸۶۳ء میں آٹھ جلدوں میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس کی تیسری جلد میں صفحہ ۱۲۷۷ پر ''زاغت الشمّس'' کے یہ معنی دیے گئے ہیں:

The sun declined from the meridian	آفتاب نصف النہار سے یوں زوال پذیر ہوا کہ
so that the shade turned from one	اس کا سایہ ایک سمت سے دوسری سمت ہوگیا۔

side to the other". (46)

یہ تو ڈیڑھ صدی پرانا ترجمہ ہوا۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ زاغت الشّمس کے الفاظ کی تشریح کے لیے، ہمیں ڈیڑھ صدی پرانی لغت کی بجائے ساڑھے گیارہ صدی قدیم صحیح بخاری سے رہنمائی مل رہی ہے۔ صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے کے لیے اس ترجمے سے مدد لی گئی ہے جس کے مترجم ڈاکٹر محمد محسن خان ہیں۔ یہ ترجمہ پہلے ۱۹۷۶ء-۱۹۷۹ء کے درمیان لاہور سے نو جلدوں میں شائع ہوا، اور پھر ۱۹۹۷ء میں دارالسلام نے ریاض اور لاہور سے نو جلدوں میں شائع کیا۔ اردو ترجمہ علامہ وحیدالزماں کا ہے۔ ان تراجم سے تین احادیث لی گئی ہیں:

(ا) پہلی حدیث: (الف) The translation of the meaning of Sahih Al-Bukhari (Vol:I), 1976, page No:305 Hadith No:515 Translator Dr. M. Mohsin Khan ۔(۴۷)

(ب) صحیح بخاری شریف (مترجم) جلد اول صفحہ ۳۰۵، حدیث ۵۱۱ مترجم علامہ وحید الزماں (۱۹۹۹ء)۔(۴۸)

عربی متن (صفحہ ۳۰۵)	اردو ترجمہ (صفحہ ۳۰۵)(۴۸)	انگریزی ترجمہ (صفحہ ۳۰۵)(۴۷)
باب : وقت الظهر عند الزوال	باب: ظہر کا وقت سورج ڈھلنے پر ہے	Chapter: The hour of Zuhur prayer is when the sun declines. (Just after mid-day)
وقال جابر كان النبیؐ يصلي بالهاجرة اخبرني انس بن مالك ان رسول اللہؐ خرج حين زاغت الشمس فصلی الظهر	اور حضرت جابر نے کہا نبیؐ ظہر کی نماز پڑھتے دوپہر کی گرمی میں حضرت انس بن مالک نے خبر دی کہ رسول اللہؐ برآمد ہوئے سورج ڈھلے پر اور ظہر کی نماز پڑھائی	Jabir said: The Prophet (PBUh) used to affer the Zuhur prayers just after mid-day. Narrated Anas bin Malik ALLAH's apostle (PBUh) came out as the sun declined at mid-day and affered the Zuhur prayer.

(II) دوسری حدیث: اگلی حدیث مندرجہ بالا اردو ترجمے کی جلد اول میں نمبر ۵۱۲ (۴۹) اور انگریزی ترجمے کی جلد اول میں نمبر ۵۱۶ (۵۰) پر، ان الفاظ میں ہے:

عربی متن	اردو ترجمہ (صفحہ ۳۰۵) (۴۹)	انگریزی ترجمہ (صفحہ ۳۰۵) (۵۰)
وکان یصلی الظھر اذا	اور ظہر اس وقت پڑھتے	He used to affer the Zuhur
زالت الشمس (صحیح	جب سورج ڈھل جاتا۔	prayers as soon as the sun
بخاری	(مترجم علامہ وحیدالزماں)	declined (مترجم ڈاکٹر محمد محسن خان)

(III) تیسری حدیث: نماز ظہر کی جلد ادائیگی کے بارے میں یہ حدیث انگریزی ترجمہ کی جلد اول میں نمبر ۵۸۹ (۵۱) اور اردو ترجمے کی جلد اول میں نمبر ۵۸۶ (۵۲) پر ہے:

عربی متن	اردو ترجمہ (صفحہ ۳۳۰) (۵۲)	انگریزی ترجمہ (صفحہ ۳۳۹) (۵۱)
عن ابی ھریرۃ ان	ابو ہریرہ نے خبر دی رسول	Narrated Abu Huraira ALLAH's
رسول اللہؐ قال ولو	اللہؐ نے فرمایا اگر (لوگ)	Apostle (PBUh) said ..... if they
یعلمون ما فی التھجیر	جانتے جو (ثواب) نماز ظہر	knew the reward of Zuhur
لاستبقوا الیہ (صحیح بخاری)	کے لیے سویرے جانے میں	prayer (in the early moments
	ہے تو ایک دوسرے سے	of its stated time) they would
	آگے بڑھتے۔	race for it (go early).

پہلی اور دوسری حدیث میں نماز ظہر کے وقت کے لیے سورج کے **زالت** یا **زاغت** کی پوزیشن میں آنے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جبکہ تیسری حدیث میں نماز ظہر کی ادائیگی سورج ڈھلتے ہی کر لینے کی فضیلت کے لیے رسول کریمؐ کا فرمودہ سند کے طور پر درج ہے۔

اکیسویں صدی عیسوی کا قاری ان احادیث پر غور کرے، پھر حافظ ابن حجر کی طرح اس پر غور کرے کہ **اشتد الضحاء** کا مطلب **زاغت الشمس** کا اول وقت بھی نکل سکتا ہے اور آخر میں اس واقعاتی شہادت پر غور کرے کہ جس دن (پیر) کو رسول کریمؐ کا وصال ہوا اور یہ دن تاریخ کا ایک اہم ترین دن ہے، اس روز فجر کی باجماعت نماز کا ذکر تو تاریخ اور حدیث دونوں میں خاصی تفصیل سے ملتا ہے (اور واضح رہے کہ تاریخ حدیث سے پہلے لکھی گئی)، لیکن اس کے بعد

پیر کے روز، نماز ظہر سے نماز عشاء تک، باجماعت نماز کا ذکر نہ تاریخ میں ہے، نہ حدیث میں۔ جب یہ پورا دن گزر جاتا ہے تو اگلے روز منگل کو فجر کی باجماعت نماز کا دوبارہ ذکر ملتا ہے، جب پہلے خلیفہ کی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

اکیسویں صدی عیسوی کا قاری یہ بھی ذہن میں رکھے کہ حضرت عروہ بن زبیرؓ کی روایت (زاغت الشمس) پہلی صدی ہجری کی ہے۔ ان کی ولادت اور رسول کریمؐ کے وصال میں صرف تقریباً دس سال کا فرق ہے اور ان کا انتقال پہلی صدی ہجری ختم ہونے سے پہلے ہوا۔ ابن اسحاق/ابن ہشام کی روایت دوسری صدی ہجری کی ہے۔ اگر دوسری باتیں مختلف نہ ہوں تو یہ تاریخی اصول ہے کہ قریب العہد روایت کو بعید العہد روایت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ حضرت عروؓہ صرف قریب العہد ہی نہیں بلکہ ان کے خانوادے کو رسول کریمؐ سے جو قربت تھی، وہ بھلا ابن اسحاق یا ابن ہشام کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ حضرت عروہ کی پہلی صدی ہجری کی روایت کو علامہ ابن شہاب زہری اور موسی بن عقبہ جیسے جید صاحبان المغازی نے تسلسل سے دوسری صدی ہجری میں جاری رکھا۔ ابن اسحاق/ابن ہشام نے دوسری صدی ہجری میں اپنی روایت کی کوئی سند نہیں لکھی اور اگر انہوں نے اشتد الضحاء کے الفاظ زاغت الشمس کے مفہوم میں استعمال کیے تو زاغت الشمس کی مستند، مستحکم اور مسلسل روایت کی موجودگی میں وقت وصال نبویؐ کے لیے، نئے الفاظ اختراع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور کیے تھے تو پرانی روایت کے رد اور نئی روایت کی تائید میں جو کچھ لکھنا لازمی تھا، وہ کیوں نہیں لکھا؟ اس کے بعد آگے کیا لکھا جائے، سوائے اس کے کہ اگر یہ تحریری کاوش دربار رسالت مآبؐ میں شرف قبولیت پائے تو قلم یہ لکھے گا کہ رسول کریمؐ کے وصال کا وقت ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ/۸/جون ۶۳۲ء کو نماز ظہر کے اول وقت تھا، جب آفتاب نصف النہار سے ڈھل چکا تھا لیکن جون کی گرمی کی شدت نصف النہار پر تھی۔

حواشی اور حوالہ جات

نمبر شمار، رسالے/کتاب کا نام	مصنف، مولف، مرتب، مترجم	صفحہ نمبر	ناشر، سال اشاعت
(۱)(i) سیرۃ النبیؐ (جلد دویم)	مصنف: شبلی نعمانی اور سید سلیمان	۱۷۰ (حاشیہ) (i)	مطبع معارف، اعظم گڑھ،

	ندوی (اضافہ وتکملہ)		بھارت، ۱۹۳۳ء
(ii) ایضاً	ایضاً	۱۷۶ (حاشیہ)	(ii) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد پاکستان، ۱۹۸۵ء
(۲)(i) The Translation of the meanings of Sahih Al-Bukhari (Vol-I)	مرتب: امام بخاریؒ، مترجم: ڈاکٹر محمد محسن خان، اسلامک یونیورسٹی، مدینہ	۴۰۳	Kazi Publications, 121, Zulqarnain Chambers, Ganpat Road Lahore
(ii) صحیح بخاری شریف (مترجم) جلداول	مرتب: امام بخاریؒ مترجم: علامہ وحیدالزماں ایضاً	۳۸۱	باب "Looking around white praying"، حدیث: ۷۲۱، ۱۹۷۶ء۔ کتاب الاذان، حدیث: ۷۱۷ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء
(۳) ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
(۴) The Translation of the meanings of Sahih Al-Bukhari (Vol-I)	نمبر شمار ۲ پر درج ہے	۴۰۲	نمبر شمار ۲ پر درج ہے۔ ۱۹۷۶ء
(۵) فتح الباری شرح صحیح البخاری (آٹھویں جلد)	مصنف: حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی	۱۸۱	دار الکتب العلمیہ ، بیروت لبنان (چوتھا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء)
(۶) سیرۃ النبیؐ (جلد دویم)	نمبر شمار ۱ پر درج ہے	۱۸۸	نمبر شمار ۱(ii) پر درج ہے، ۱۹۸۵ء
(۷) السیرۃ النبویۃ (عربی)	مولف: ابن ہشام	۸۹۷	دارالکتب العلمیہ، بیروت لبنان، ۲۰۰۹ء۔
(۸) سیرت النبیؐ (عربی سے اردو ترجمہ) جلد دویم	ایضاً مترجم: عبدالجلیل صدیقی	۸۰۳	شیخ غلام علی اینڈ سنز، انارکلی لاہور

	نظر ثانی و تہذیب : مولانا غلام رسول مہر		۱۹۷۹ء۔
(۹) رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)	مصنف: قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری	۲۷۷	دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی ۱۹۹۱ء۔
(۱۰) رسول کریمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے آخری لمحات	مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد	۳۸	مکتبہ جمال، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۲۰۰۸ء۔
(۱۱) الرحیق المختوم (عربی)	مصنف: صفی الرحمٰن مبارک پوری	۴۷۵	دار ابن حزم، بیروت لبنان ۲۰۱۰ء
(۱۲) ایضاً (عربی سے اردو ترجمہ)	ایضاً	۶۳۰	مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور ۲۰۰۳ء
(۱۳) ایضاً (عربی سے انگریزی ترجمہ)	ایضاً	۴۷۹	مکتبہ دارالسلام لاہور/ریاض ۱۹۹۵ء
(۱۴) The Life of Muhammadؐ (السیرۃ النبویہؐ سے انگریزی ترجمہ)	مصنف: ابن اسحاق، مترجم: الفرڈ گیوم	۶۸۲	پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی ۔۱۹۶۷ء۔
(۱۵) مغازی رسول اللہؐ لعروۃ بن الزبیر (بروایت ابی الاسود)	مولف: حضرت عروہ بن زبیرؓ جامع: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی	۲۲۲	مکتبہ التربیت العربی لدولی الخلیج، ریاض ۱۹۸۱ء۔
(۱۶) کتاب المغازی (عربی متن) جلد ۳	مصنف: محمد بن عمر بن واقدی تحقیق: ڈاکٹر مارسڈن جونز	۱۱۲۰ ۱۷۱	(i) پہلا عربی ایڈیشن ۱۹۶۶ میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ۔ (ii) عالم الکتب ، بیروت لبنان ۔ (تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء)
(۱۷) طبقات الکبیر (عربی متن) جلد ۲	مصنف: محمد بن سعد تحقیق: ڈاکٹر علی محمد عمر		مکتبہ الخانجی، الشرکہ الدولیہ للطباعۃ، منطقہ صناعیہ ثانیہ، قطعہ ۱۳۹، شارع ۳۹، مدینہ، ۶/اکتوبر، قاہرہ مصر۔
(۱۸) طبقات ابن سعد (عربی سے اردو ترجمہ) حصہ اول	مصنف: محمد بن سعد مترجم: عبداللہ العمادی	۴۷۴	نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ کراچی

			اشاعت سویم ۱۹۸۳ء
(۱۹) نبی رحمتؐ (عربی سے اردو ترجمہ)	مصنف: سید ابوالحسن ندوی	۵۴۵	مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی ۔ (سن نہیں دیا)
(۲۰) اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۱۲)	زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی لاہور	۷۱۲	شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور پاکستان ۲۰۰۵ء دوسرا ایڈیشن
(۲۱) ایضاً (جلد ۱۳)	ایضاً	۲۷۳	ایضاً ۱۹۷۶ء
(۲۲) ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً
(۲۳) سیرت نگاری-آغاز و ارتقاء	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر	۱۰۳	قرطاس، پوسٹ بکس ۸۴۵۳، کراچی یونیورسٹی کراچی ۷۵۲۷۰، ۲۰۱۰ء۔
(۲۴) ایضاً	ایضاً	۱۲۵	ایضاً ایضاً
(۲۵) ایضاً	ایضاً	۱۲۶	ایضاً ایضاً
(۲۶) ایضاً	ایضاً	۱۰۴	ایضاً ایضاً
(۲۷) ایضاً	ایضاً	۱۲۶	ایضاً ایضاً
(۲۸) ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً ایضاً
(۲۹) The Life of Muhammad (Introduction)	نمبر شمار ۱۴ پر درج ہے۔	۴۳-۴۷	نمبر شمار ۱۴ پر درج ہے، ۱۹۶۷ء۔
(۳۰) The Life of Muhammad	نمبر شمار ۱۴ پر درج ہے	۶۸۲	ایضاً ایضاً
(۳۱) السیرۃ النبویۃؐ (عربی)	نمبر شمار ۷ پر درج ہے	۸۹۷	نمبر شمار ۷ پر درج ہے ۲۰۰۹ء
(۳۲) سیرت النبیؐ (عربی سے اردو ترجمہ) جلد دویم	نمبر شمار ۸ پر درج ہے	۸۰۳	نمبر شمار ۸ پر درج ہے ۱۹۷۹ء
(۳۳) کتاب المغازی (عربی) (ج۳)	نمبر شمار ۱۶ پر درج ہے	۱۱۲۰	نمبر شمار ۱۶ پر درج ہے ۱۹۸۴ء
(۳۴) طبقات الکبیر (عربی) (ج۲)	نمبر شمار ۱۷ پر درج ہے	۱۷۱	نمبر شمار ۱۷ پر درج ہے ۲۰۰۱ء

(۳۵) طبقات ابن سعد (اردو ترجمہ) حصہ اول	نمبر شمار ۱۸ پر درج ہے	۴۷۴	نمبر شمار ۱۸ پر درج ہے ۱۹۸۳ء
(۳۶) فرہنگ فارسی، انگلیسی نوین جلد اول)	مولف: محمد ساعتچی	۴۱۱	انتشارات پائینیر، طہران، ایران (ایرانی سنہ ۱۳۷۰)
(۳۷) فرہنگ آصفیہ (جلد دویم)	مرتب: مولوی سید احمد دہلوی	۹۲	مرکزی اردو بورڈ، گلبرگ لاہور ۱۹۷۷ء
(۳۸) اردو لغت - تاریخی اصول پر (جلد ہفتم)	مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۲۷۶	اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کراچی ۱۹۸۶ء
(۳۹) رحمۃ للعالمینؐ (جلد اول)	نمبر شمار ۷ پر درج ہے	۲۷۷	نمبر شمار ۷ پر درج ہے ۱۹۹۱ء
(۴۰) مغازی رسول اللہؐ (حضرت عروہ بن زبیرؓ) عربی سے اردو ترجمہ	تحقیق: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی مترجم: محمد سعید الرحمٰن علوی	۲۲۹	ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ لاہور (دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء)
(۴۱) ایضاً	ایضاً	۸۲	ایضاً ایضاً
(۴۲) ایضاً	ایضاً	۸۳	ایضاً ایضاً
(۴۳) ایضاً	ایضاً	۸۸	ایضاً ایضاً
(۴۴) ایضاً	ایضاً	۶۸	ایضاً ایضاً
(۴۵) مغازی رسول اللہؐ لعروۃ بن الزبیر (بروایت ابی الاسود) (عربی)	نمبر شمار ۱۵ پر درج ہے	۲۲۲	نمبر شمار ۱۵ پر درج ہے ۱۹۸۱ء
(۴۶) Arabic-English Lexicon (part:3)	مولف: ایڈورڈ ولیم لین	۱۲۷۷	ولیمز اینڈ نورگیٹ ہنریٹا سٹریٹ کوونٹ گارڈن لندن ۱۸۶۳ء
(۴۷) The Translation of the meanings of Sahih	نمبر شمار ۲ پر درج ہے	حدیث نمبر ۵۱۵	کتاب مواقیت الصلوٰۃ نمبر شمار ۲(i) پر درج ہے ۱۹۷۶ء

Al-Bukhari (Vol-I)		۳۰۵			
(۴۸) صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلد اول)	نمبر شمار ۲(ii) پر درج ہے	۳۰۵ (حدیث: ۵۱۱)	نمبر شمار ۲(ii) پر درج ہے		
(۴۹) ایضاً	ایضاً	۳۰۵ (حدیث: ۵۱۲)	ایضاً کتاب مواقیت الصلوٰۃ	ایضاً	
(۵۰) The Translation of the meanings of Sahih Al-Bukhari (Vol-I)	نمبر شمار ۲(i) پر درج ہے	۳۰۶ (حدیث: ۵۱۶)	کتاب مواقیت الصلوٰۃ	ایضاً	۱۹۷۶ء
(۵۱) ایضاً	نمبر شمار ۲(i) پر درج ہے	۳۳۹ (حدیث: ۵۸۹)	کتاب الاذان	ایضاً	
(۵۲) صحیح بخاری شریف (مترجم) (جلد اول)	نمبر شمار ۲(ii) پر درج ہے	۳۳۰ (حدیث: ۵۸۶)	کتاب الاذان	ایضاً	۱۹۹۹ء

اعجاز قرآن اور مستشرقین

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

اسلام اللہ رب العزت کی طرف سے سارے بندگان خدا کے لیے ضابطۂ زندگی اور نعمت عظمیٰ ہے، جس کی تکمیل خاتم الانبیاءؐ کے ذریعہ ہوئی۔قرآن مجید کو اس مکمل ترین اور عالم گیر ضابطۂ زندگی کے منشور کا مقام حاصل ہے جو اپنے اندر جغرافیائی حد بندیوں اور رنگ و نسل کے فرق و امتیاز سے قطع نظر پوری انسانی برادری اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے کتاب ہدایت ہونے کی اہلیت رکھتا ہے، اس لیے کہ خاتم النبیین محمد عربیؐ تا قیام قیامت ساری دنیا کے لیے نبی رحمت بنا کر بھیجے گئے، ظاہر ہے قرآن مجید کی شکل میں جو نوشتۂ ہدایت آپ کو ملا اسے بھی پوری دنیا کے لیے اور منطقی طور پر قیامت تک کے لیے رہنما کتاب کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

یہ آفاقی کتاب ہدایت حق و باطل، جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں فرقان کا مقام رکھتی ہے، ظلم و عدوان کے خلاف آواز اٹھاتی ہے، انسانیت نوازی اور بشر دوستی کا پیغام عام کرتی ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتی ہے، ضلالت و گمرہی کے قعر عمیق سے نکال کر شاہراہ ہدایت پر لا کھڑا کرتی ہے اور پوری انسانیت کو معبودان باطل کے طوق و سلاسل سے نجات دلا کر بشریت کی معراج تک پہنچا دیتی ہے، بایں طور انسانی زندگی کے ہر ناحیے کو انقلاب سے روشناس کرا دیتی ہے۔قرآن مجید کی عظمت کا یہ فکری یا نظریاتی پہلو ہے اس کی عظمت کا ایک دوسرا پہلو ہے جسے ادبی پہلو سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور بلا شبہ اس پہلو سے بھی دنیا کی دیگر تالیفات و تصنیفات کے بالمقابل عظمت و رفعت کی وسعتوں کو چھوئے ہوئی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید ایک طرف دینی و فکری سرمایہ ہے تو دوسری طرف بے مثل فنی و ادبی

ریڈر شعبہ دینیات، سنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نمونہ۔ اگر تعصب وتنگ نظری کے حصار سے نکل کر قرآنی عظمت کے ان دونوں پہلوؤں کو مستحضر رکھا جائے اور دنیا کی دیگر تمام تر علمی کاوشوں سے موازانہ کیا جائے تو ایک غیر جانب دار مبصر و مشاہد کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس کا کوئی ثانی پیش کیا جاسکا ہے اور نہ کبھی پیش کیا جاسکے گا جیسا کہ اس کتاب کے مصنف کا یہ چیلنج ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	کہہ دواے نبی! اگر جن وانس ایکا کر؟ ملیں کہ وہ
عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	اس قرآن کے جیسا کچھ پیش کر دیں گے تو وہ
لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ	پیش نہیں کر سکتے، اگر چہ ان میں کے بعض بعض
لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (۱)	کے مددگار ہو جائیں۔

بلاشبہ پوری دنیا کے مسلمان اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ کتاب ایک معجزہ ہے جو نبی کریمؐ کو نبوت کی دلیل کے طور پر عطا کیا گیا اور چونکہ نبی عربیؐ قیامت تک کے لیے نبی ہیں، اس لیے یہ سند نبوت بھی قیامت تک کے لیے معجزہ ہے۔ قرآن مجید کے اعجاز اور وجوہ اعجاز کے سلسلے میں علماء کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض تو موضوع و مقصد کی بلندی و پاکیزگی کو قرآن کی اصل وجہ اعجاز قرار دیتے ہیں تو بعض حضرات نیرنگی مضامین ومطالب اور پیشین گوئیوں کی موجودگی کو، جبکہ بعض دوسرے علماء وادباء دل کش فصاحت پرزور طرز استدلال، حیرت انگیز بلاغت نیز واضح اور مبرہن مسلک کو سبب اعجاز قرار دیتے ہیں۔

بلاشبہ وسعت فکر ونظر، خوبی تراکیب، مضامین کی بلندی، مقصد کی عظمت، موضوعات کی نیرنگی، تاریخی حقائق کے بیان، پیشین گوئیوں کے اعلان اور دوسری تمام فکری وفنی خصوصیات میں قرآن مجید کا اعجاز ناطق ہے اور بلاشبہ فکر وفن کی جن جن ندرتوں کا تصور کیا جاسکتا ہے، قرآن مجید ان سے بدرجۂ اتم مرصع ومزین ہے، سچ تو یہ ہے کہ انسانی کاوشیں اس کی گردراہ کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ ہاں قرآن مجید کی اصل وجہ اعجاز سے متعلق اس رائے میں موزونیت ہے جس میں اس کی طرف دلکش اسلوب نگارش اور اعلی درجے کی فصاحت و بلاغت کو منسوب کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو عرب اول مدعو ومخاطب کی حیثیت رکھتے تھے وہ مقصد کی عظمت فکر کی بلندی اور تاریخ نگاری پر مغرور نہیں تھے، انہیں زبان دانی پر ناز تھا اور وہ بلاشبہ فصاحت و بلاغت

کی امامت و پیشوائی کے علم بردار تھے، اسی وجہ سے وہ غیر عربوں کو بے زبان اور گونگا قرار دے دینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے۔ زبان و بیان کے دقیقہ شناس اور ہمہ دانی کے مدعی عربوں پر جب انوار قرآنی کی تجلیاں پڑیں تو وہ محو حیرت ہوگئے، انہوں نے اس کلام ربانی کو عجیب وغریب چیز (۲) قرار دیا۔ خطابت و شاعری کے ماہر و مشاق اور قدرت بیان میں لاثانی عرب ششدر و سراسیمہ اور حیران و پریشان تھے کہ کلام کی مروجہ اقسام و اصناف میں کس قسم وصنف سے موسوم کیا جائے، چنانچہ اضطراب و بے چینی کی حالت میں کبھی کلام مقدس کو شاعری (۳) کا نام دیا تو کبھی اس کی طرف سحر (۴) کو منسوب کیا تو کبھی کاہنوں کی سجع بندی (۵) اور جنوں کے کلام (۶) سے تعبیر کیا، اس صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سند رسالت کی تکذیب کے لیے اس کلام مقدس کے ثانی پیش کیے جانے سے متعلق معاندین کی طرف سے لقلنا ہذا کی رٹ سراپا حیرت اور دعوائے محض ثابت ہوئی اور اسے قطع نظر رنگ ونسل اور زمان و مکان کے تمام بنی نوع انسان کے لیے اور قیامت تک کے لیے زندۂ جاوید معجزہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

قرآنی ادبیات کی مختلف شقوں کو علمائے مشرق کے علاوہ علمائے مغرب نے بھی اپنی وقیع تصنیفات میں موضوع بحث بنایا ہے۔ قبل اس کے کہ قرآنی اعجاز سے متعلق مستشرقین کے ملاحظات کو حوالۂ ناظرین کیا جائے۔ استشراق اور مستشرق کے اصطلاحات کی بالاختصار وضاحت مناسب اور مفید مطلب ہوگی:

دی شارٹر آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق استشراق میں مشرقی اخلاق و کردار، طرز و ادا اور خصلت و خصوصیات کا مفہوم پنہاں ہے (۷)، اسی طرح اسی ڈکشنری میں مستشرق کی یوں وضاحت ملتی ہے:

مستشرق وہ ہے جو مشرقی زبان و ادب میں اپنے آپ کو مشغول و منہمک کیے ہوا ہو۔ (۸)

استشراق اور مستشرق کے تعلق سے جناب ایڈورڈ سعید کی یہ عبارتیں قابل ذکر ہیں، مشرق جو استشراق یا اورینٹلزم کے لبادے میں ظاہر ہے وہ دراصل (مغرب کی) نمائندگی کا ایک نظام ہے جس کی تشکیل مختلف طاقتوں کے ذریعہ عمل میں آئی اور جو مشرق کو مغربی علم، مغربی شعور اور مغربی سلطنت کی قلمرو میں لے آیا...... استشراق تبیین وتوضیح کا ایک مکتبہ فکر ہے جس کا مواد

مشرق، مشرقی تہذیب، مشرقی عوام اور مشرقی اقامت گاہیں ہیں۔(۹)

استشراق فی الواقع ایک نظریہ سے بڑھ کر تحریک کا نام ہے جس کے علم بردار جز وقتی عاملین کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ہمہ وقتی خدام کی حیثیت سے مشرقی علوم وفنون اور اہل مشرق کے فکر وخیال اور تہذیب وثقافت سے قلم وقرطاس کے ذریعہ گہری وابستگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ یقیناً یہ انصاف اور علمی دیانت داری کے خلاف ہوگا، اگر اسلامی علوم وفنون سے متعلق ان کی بعض اہم علمی اور تحقیقی کاوشوں کا اعتراف نہ کیا جائے۔ تاہم یہ سچ ہے کہ ان کے فکر وقلم کی شبانہ روز مساعی میں عیسائیت کو برتر اور منزہ شکل میں پیش کرنے اور اسلام کو کمتر اور مسخ شدہ شکل میں پیش کرنے کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک نامور محقق ومورخ کا یہ تبصرہ بجا معلوم ہوتا ہے:

> ''یوروپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتا ہے۔ اس میں بہت کچھ اس کی خودغرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے۔ تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں''۔(۱۰)

ایڈورڈ سعید تحریک استشراق کے نبض شناس کی حیثیت سے علمی دنیا میں معروف ہیں۔ ان کی کتاب اورینٹلزم کے یہ چند الفاظ استشراقی مزاج پر ناطق ہیں:

> Orientalism is not only a positive doctrine about the orient that exists at anyone time in the west, it is also an influential academic tradition. (11)

> (استشراق مشرق کے بارے میں محض ایک مثبت نظریے سے عبارت نہیں ہے جو کبھی مغرب میں موجود رہا ہو، بلکہ یہ ایک موثر علمی روایت بھی ہے)

مستشرقین نے جن موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے، ان میں قرآن مجید ایک اہم موضوع ہے۔ چونکہ یہ شریعت اسلامیہ کا اول اور مستند ترین ماخذ ہے، اس لیے اس موضوع پر ان کا توجہ مرکوز کرنا ان کے لیے ناگزیر ضرورت اور محبوب مشغلہ قرار پایا۔ فکری یا نظریاتی پہلو کے علاوہ قرآن مجید کا ادبی پہلو بھی کم وبیش تمام علمائے استشراق کی علمی کاوشوں کا محور رہا ہے۔ لاثانی

فصاحت و بلاغت، نظم و ترتیب اور اسلوب بیان کے علاوہ بعض دیگر مہتم بالشان موضوعات پر مبسوط مباحث ان کے علمی کاموں کی زینت بنتے ہیں۔ایک مختصر مقالے میں یہ قطعاً ممکن نہیں کہ قرآنی ادبیات سے متعلق مستشرقین کی علمی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ اس مقالے میں صرف انگریز مستشرقین کو پیش نظر رکھا گیا ہے جنہوں نے براہ راست قرآن مجید کے اعجاز بیانی پر اپنے مکر و خیال کا سرمایہ لٹایا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے ایک طرف قرآنی ادبیات کو لاثانی بتایا ہے تو دوسری طرف خدائی کلام سے موسوم کرنے میں تردد و تذبذب سے کام لیا ہے اور بعض تو ایسے بھی ہیں جنہوں نے بڑی ڈھٹائی کا ثبوت دیتے ہوئے اور علمی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے اسے خاتم الانبیاء محمد عربیؐ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا مجموعہ قرار دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

ان مستشرقین کی بزم میں پروفیسر آرتھر جان آربری نسبتاً دیانت دار مستشرق ہیں، دی قرآن انٹرپریٹیڈ کے علاوہ اسلام ٹوڈے، رباعیات خیام، ماڈرن عربک پوئٹری، دی ہولی قرآن، ان انٹروڈکشن ودسیلیکشن، دی سیوین اوڈس، ریلی جینس ان دی مڈل ایسٹ جیسی علمی کاوشیں مشرق سے ان کی گہری وابستگی اور علوم اسلامیہ پر دسترس کی سند فراہم کرتی ہیں۔

آربری اپنی کتاب Revelation and Reason in Islam میں قرآن مجید کے ساتھ ہی ساتھ احادیث نبویہ کی عظمت واستناد کے قائل ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ خود سیرت نبوی پر بھی اللہ کی مخصوص ہدایت و رہنمائی کی گہری چھاپ ہے (۱۲)۔قرآن مجید کی عظمت بتاتے ہوئے قرآن سے متعلق گویا ہیں کہ انسانی تاریخ میں اس کتاب نے بڑے گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور ان کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔قرآن مجید ایک ایسی مذہبی تحریک کا ثابت ہوا جس نے اثر و رسوخ کی حامل، مستحکم، پروقار اور وسعتوں سے ہمکنار تہذیب کی افزائش کا بیڑا اٹھایا۔ (۱۳) اعادہ و تکرار عام طور پر انسانی تصنیف و تالیف میں نقص ہوتا ہے قرآن مجید میں اگرچہ واقعات و قصص اور انفصال و اخبار کے بیان میں یہ پہلو جگہ جگہ موجود ہے لیکن یہ قرآن مجید کا ایک وصف ہے اور اس طرز بیان میں شیرینی و اثر آفرینی اپنی جاتی ہے اور بسا اوقات یہ انداز بیان قاری یا مخاطب کو حیرت انگیز طریقے سے مخصوص واقعہ یا قصہ کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت

کرتے ہوئے مقصود و مدعا تک پہنچانے میں زبردست عامل ثابت ہوتا ہے۔قرآن مجید کے اس بے مثل اعادہ وتکرار پرآربری کی یہ عبارت ملاحظہ کی جائیں:

"Truth can not be denied by being frequently stated but only gains in clarity and convincing ness at every repitition and wher all is true, in consequence and incomprehen sibility are not felt to arise". (14)

(تکرار کے ساتھ کوئی صداقت اگر بیان کی جائے تو انکار لازم نہیں آتا بلکہ صداقت واعادہ پر وضاحت اوراثر آفرینی کے اعتبار سے اورمزین ہوجاتی ہے اور جب کہ کوئی کلام سرتاپا حق ہو (تکرار کے باوجود) بے ربطی وابہام کے پیدا ہونے کا خیال تک نہیں کیا جاتا)

قرآن مجید کے اعجازی پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے دوسری زبانوں میں ترجمہ قرآن کے عدم امکان پربھی آربری سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔آربری کے بقول قرآن مجید میں جو فصاحت وبلاغت اوربحوروقوافی ہیں وہ بہت ہی نمایاں،سامعہ نوازاور بڑے زوردار ہیں،چنانچہ اس کے پرشکوہ اورمہتم بالشان اسلوب کوکسی اورزبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا(۱۵)،آربری کے مندرجہ ذیل تجزیے میں قرآن مجید کے لاثانی کلام ہونے اورقیامت تک کے لیےاس کے معجزہ ہونے سےمتعلق فکرراست کی ترجمانی ہوتی ہے:

"If arabic could and can never be spoken as it was spoken in the koran, certainly the arabic of the koran defies the adequate translation". (16)

(عربی جس طرح قرآن مجید میں بولی گئی،اگرایسی نہ کبھی بولی گئی اورنہ کبھی بولی جاسکتی ہےتو یقینی طور پرقرآن مجید کی عربیت کا یہ چیلنج ہے کہ اس کا صحیح ترجمہ پیش نہیں کیا جاسکتا)

اعجازقرآن پرخامہ فرسائی کرنے والوں میں فلپ کے ہٹی بھی ہیں۔اگرچہ قرآنیات پر ان کی باضابطہ کوئی تصنیف منظرعام پرنہ آسکی تاہم اسلام،اسلامی تہذیب وتمدن اورتاریخ عرب اس کی گراں قدرتصنیفات ہیں۔اگرچہ ہٹی ان مستشرقین کے عام طرزفکر کی روش پر چلتے ہوئے بہت سے معاملات ومسائل کی بحث وتمحیص میں قابل مواخذہ ہیں تاہم اعجازالقرآن کے موضوع

پر ان کے نتائج بحث صحت مند فکر و خیال کی غمازی کرتے ہیں ۔ قرآن مجید کے طرز بیان اور اسلوب نگارش پر اپنے خیالات یوں رقم کرتے ہیں:

"The style of the Quran is God's style. It is indifferent, incompareable and inimitable. This is basically, what constitutes the miraculous character (Ijaz) of the Koran. Of all miracles, it is the greatest: if all menand jinn were to colaborate, could not produce its like. (17)

(قرآن مجید کا طرز بیان خدا کا طرز بیان ہے ۔ یہ نرالا ، بے نظیر اور لاثانی و یکتا ہے، یہی بنیادی طور پر قرآن مجید کے اعجاز متعین کرتا ہے ۔ تمام معجزات میں یہ سب سے بڑا معجزہ ہے ۔ اگر تمام جن وانس بھی مجتمع ہو جائیں تو اس کا مثیل پیش نہیں کر سکتے)

مشرق و مغرب کے علماء و دانشوروں نے اعجاز القرآن کے جن مختلف پہلوؤں کو اپنی بحث و تحقیق کا موضوع بنایا ہے ان میں اقوام و علل کے احوال و کوائف سے آگاہی بھی قابل ذکر ہے ۔ پروفیسر ہٹی نے بھی قرآنی قصص پر دانش ورانہ گفتگو کی ہے اور اس باب میں قرآنی عظمت کو وا کرتے ہوئے اپنے قارئین کو یہ گوش گزار کرایا ہے کہ افراد و اقوام کے یہ قصے محض تفریح طبع کے لیے نہیں ہیں اور نہ ہی یہ کسی خبر نامہ کے چند مشتملات و مباحث کی حیثیت سے ہیں بلکہ انسانیت کی اصلاح حال کے لیے ہیں اور ایک عظیم الشان ہدایت نامہ کے روح پرور اور فکر انگیز مواعظ حسنہ ہیں ۔ ہٹی کی یہ عبارتیں قابل ملاحظہ ہیں:

All these narratived are used didacticlly, not for the object of telling a story but to preach a moral, to teach that god informer times has always rewarded the righteous and punished the wicked. (18)

(یہ تمام قصے ناصحانہ طور پر بیان کیے گئے ہیں، نہ کہ کہانی سنانے کے مقصد سے ۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ اخلاقیات کا درس دیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی میں نیکوکاروں کو نوازا ہے اور بدکاروں کو سزا دی ہے)

مستشرقین میں الفرڈ گیام علم و دانش اور بڑی حد تک راست روی اور صحت مند فکر و خیال

کے لحاظ سے مؤقر اور بلند قامت شخصیت کے مالک ہیں ۔ دی لائف آف محمد ، پروفیسی اینڈ ڈیوینیش امنگ دی ہیبر یوز اینڈ ادر سیمائٹس ، نیولائٹ آن دی لائف آف محمد ، اسلام اور دی ٹریڈیشن آف اسلام، قرآن اور سیرت نبوی پر قابل قدر تصنیفات، ایمان ویقین سے محروم علماء خواہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، یہ توقع بے جا ہوگی کہ وہ اسلام اور قرآن سے متعلق شریعت محمدی کے علم بردار اور حاملین قرآن کی طرح اپنے افکار و ملاحظات پیش کریں، تاہم راقم کی رائے میں مغرب کے اہل دانش میں الفرڈ گیام نے قابل ذکر حد تک تعصب و جانب داری کے حصار سے نکل کر فراخی ذہن اور سیر چشمی کا ثبوت دیا ہے۔ وحی الٰہی، عظمت قرآن، حفاظت قرآن، جمع قرآن، ناسخ ومنسوخ اور نظم قرآن جیسے مباحث اس کی دلچسپی کے اصل محور ہیں، بیشتر موضوعات پر فکر و تحقیق کی روش پر گامزن ہوتے ہوئے اہم حقائق کا اعتراف کیا ہے، بلکہ ان کی توجیہ کی ہے۔

قرآن مجید کے لوح محفوظ کی ہو بہو نقل ہونے سے متعلق اپنی تمہیدی گفتگو میں عیسائی اور یہودی علماء کی طرف اس اعتراف حقیقت کو منسوب کیا ہے کہ ان کی مقدس کتب میں آمیزش و انحراف اور تغیر وتبدل واقع ہوگیا ہے لیکن قرآن کی بابت مسلمانوں کی طرف اس ناخوشگوار وقوع کو بہر حال منسوب نہیں کیا جاسکتا (۱۹) ۔قرآن مجید کے وحی الٰہی اور اس کے معجزہ ہونے سے متعلق گیام کے یہ الفاظ قابل ملاحظہ ہوں:

In the Quran, Muhammad, who disclaimed power to perform miracles, enshrined there in were themselves miracues sight of his apostleship. More than this. The Quran was a transcript of a tablet preserved in heaven, in which is written all that has happened and all that will happen. (20)

(قرآن مجید میں محمدؐ نے معجزات کی انجام دہی سے متعلق قوت واستطاعت کا انکار کیا۔ جو معجزات قرآن میں محفوظ ہیں وہ بذات خود آپؐ کی رسالت کے حیرت انگیز ثبوت ہیں ۔ مزید برآں قرآن مجید اس لوح محفوظ کی نقل ہے جس میں جو کچھ ہوگیا ہے وہ اور جو کچھ واقع ہونے والا ہے وہ، سب موجود ہے)

گیام قرآن مجید میں نسخ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے قرآن مجید کی مستند حیثیت پر بے باکانہ گفتگو کرتے ہیں اور عام مستشرقین کی روش سے اجتناب کرتے ہوئے نسخ کو معقول اور مفید و موثر اصول سے تعبیر کیا ہے۔ مذکور دانشور کی رائے کے مطابق قرآن مجید لوح محفوظ کی نقل ہے جو من وعن اور نا قابل تغیر ہے جہاں تک رہی بات نسخ کی تو عقل عام کے نقطۂ نظر کے مطابق اور اس کی عمومی تعلیمات کو روزمرہ کی زندگی میں نافذ کرنے کے لحاظ سے یہ عمل انسانیت نوازی و بشر دوستی کا غماز ہے اور بدلتے ہوئے احوال وکوائف میں اسے دیانت دارانہ اور حکمت ودانائی پر مبنی عمل قرار دیا جانا چاہیے(۲۱)۔اس طرح قرآن مجید کی آفاقی عظمت وحیثیت ہدایت و رہنمائی کے تعلق سے انسانوں کے لیے موثر و مفید مطلب ہونے کے لحاظ سے آشکار ہوجاتی ہے۔ نسخ سے متعلق گیام کے یہ ملاحظات مسلم علماء و مفسرین کے آراء وافکار سے متضاد و متبائن نہیں ہیں۔

رینالڈ الین نکلسن کا شمار اعلی تعلیم یافتہ مستشرقین میں ہوتا ہے۔ای، جی براؤن اور رابرٹسن اسمتھ کی علمی سرپرستی نے نکلسن کو علم وآگہی کی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔اے وولیوم آف اورینٹل اسٹڈیز، رومی یوئٹ اینڈ مائنٹک، ٹرانسلیشن آف اسٹرن پوئٹری اینڈ پروز، اے لٹریری ہسٹری آف دی عربس، اسٹڈیز ان اسلامک مسٹی سزم، دی آئیڈیا آف پرسنالٹی ان صوفی ازم، دی مسٹکس آف اسلام پروفیسر نکلسن کی وہ تحقیقی کاوشیں ہیں جو علوم وفنون کی دنیا میں انہیں معتبر و موقر شخصیت کی حیثیت سے متعارف کراتی ہیں۔اگرچہ اسلامیات کے تعلق سے تصوف ان کا مخصوص میدان ہے تاہم عربی ادب وثقافت پر بھی اس دانشور نے اپنی لیاقت واستعداد کے جوہر بکھیرے ہیں اور اس کے تحت قرآن مجید کے فکری اور فنی پہلوؤں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ فترۃ الوحی، نظم قرآن، اجزائے قرآن کا صحابہ کرام کے پاس تحریری طور پر موجود ہونا، قرآن مجید میں سجع کا موجود ہونا اور کلام مقدس کا شک وشبہ سے بالاتر اور انسانی استعداد سے پرے ہونا جیسے ذیلی موضوعات پر نکلسن نے بعض مستثنیات کے ساتھ دیانت دارانہ گفتگو کی ہے۔قرآن مجید کے اعجاز پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی حقانیت کا اعتراف اور اس کے لاثانی سند ہونے پر اظہار خیال ذیل کی عبارتوں سے مترشح ہوتا ہے:

"Its Genuiness is above suspicion, we shall se, more over, that

the Koran is an exceedingly human document, reflecting every phase of Mohammad's personality and standing in close relation to the outward events of his life, so that here we have materials of unique and incontestable authority for tracing the origin and early development of islam". (22)

(اس کی صداقت وحقانیت شبہ سے بالاتر ہے، مزید برآں یہ کسی انسانی دستاویز سے مافوق ہے جو محمدؐ کی زندگی کے ہر ناحیے کی عکاسی کرتا ہے اور آپؐ کی زندگی کے تمام ظاہری احوال وکوائف سے پورے طور پر وابستہ ہے۔ اس طرح ہم اسلام کے اصل وآغاز اور اس کے ابتدائی عروج واقبال سے واقفیت کے لیے حتمی اور بےنظیر مواد پاتے ہیں)

ڈی، ایس مارگولیتھ کا شمار ان مغربی دانشوروں میں ہوتا ہے جو عربی کے ساتھ ہی ساتھ دوسری مشرقی اور مغربی زبانوں میں دسترس رکھتے ہیں۔ دمشق کی عربی اکیڈمی، برٹش اورینٹل اکیڈمی، رویال ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور لیکزیکل اکیڈمی آف بریٹین سے مدتوں اعزازی رکن کی حیثیت سے جڑے رہے۔ عربی ادب، اسلامیات اور سیرت نبوی پر اس کی گراں قدر تصنیفات اس کی عالمانہ بصیرت کی جانب اشارہ اور کسی حد تک منصفانہ تجزیوں پر سند پیش کرتی ہیں۔ چونکہ موصوف ایک عیسائی عالم ہیں اس لیے یہ توقع رکھنا بےجا ہوگا کہ ان کی تحریروں میں موحدانہ شان اور مومنانہ بصیرت کی ترجمانی ہو، تاہم اسلام، قرآن اور سیرت کے تعلق سے بعض جارحانہ خیالات کے استثناء کے ساتھ قرآن مجید کی مافوق الفطرت حیثیت اور اس کے معجزانہ کردار پر بڑی حد تک مستشرقین کے روایتی انداز سے منحرف ہوتے ہوئے گفتگو کی ہے۔ واضح لفظوں میں قرآن مجید کے خدائی کلام ہونے کا اعتراف حقیقت کرتے ہوئے گویا ہے کہ تاریخ اس عظیم الشان پیغام کا مثل پیش کرنے سے قاصر ہے (۲۳)۔ مارگولیتھ کی ان عبارتوں میں قرآن مجید کا اعجاز ناظرین کو دعوت ملاحظہ دیتا ہے:

The language of the Quran is God's language and its eloquence is miraculous: anyone who tries to rivelit can prove that for himself

and being the communication of the all wise, it is infallible guide to conduct, the authority for both statements and precepts is paramount. It is therefore, absolutely and uniquely consistant; inconsistency, which would have been the sign of human effort, can not be found in it". (24)

(قرآن کی زبان خدا کی زبان ہے۔اس کی اعجازی شان اس کی فصاحت میں عیاں ہے اور حکیم مطلق کے ایک مکتوب کی حیثیت سے اطوار زندگی کا ایک غیر خاطی راہنما ہے۔افکار و اقوال، دونوں میں اس کا استناد اعلیٰ و ارفع ہے،اس لیے حتمی طور پر اور بے مثل طریقے سے یہ مربوط ہے۔ بے ربطی یا بدنظمی جو انسانی کاوش کی علامت ہے،اس میں نہیں پائی جاسکتی)

قرآنی اعجاز کے ایک اور پہلو پر مارگولیتھ نے اپنی نوک قلم کو حرکت دی ہے اور وہ ہے عربی زبان و ادب پر اس کے گہرے اور دوررس اثرات و نتائج کا مترتب ہونا۔موصوف بڑی جرأت مندی اور ایمان داری کے ساتھ اس صداقت کو سپرد قلم کرتے ہیں کہ قرآن مجید کلام ہے اور ادبی حسن و کمال کا شاہکار ہے جس کا ہمیشہ ہمیش کے لیے کوئی مثیل و معاند نہیں ہوسکتا اور اس سرچشمہ فکر و فن کا عربی زبان میں نزول عربی زبان اور عربی زبان کی علم بردار قوم کے لیے دیگر اقوام و ملل پر تفوق و برتری کا بجا طور پر محرک ثابت ہوا۔(۲۵)

عربی زبان کی آفاقیت کو قرآن مجید کی طرف منسوب کرتے ہوئے مارگولیتھ گویا ہے:

"The theory, then, that the language of the Koran was divine, made its language worth studying, and suggested the application to that study of both deductive and inductive methods". (26)

(یہ نظریہ کہ قرآن مجید کی زبان خدائی زبان ہے،اس نے اس کی زبان (یعنی عربی) کو قابل مطالعہ بنا دیا اور استخراجی و استقرائی یا استنباطی اور منطقی طریقوں سے اس کے مطالعہ کی مناسبت و موزونیت کو باور کرایا)

قرآن مجید کتاب ہدایت اور کتاب انقلاب ہے۔بنی نوع انسان کی گردنوں سے

معبودان باطل کا قلادہ نکال کر انسانیت کی معراج سے ہمکنار کرتی ہے۔ تاریخ کی یہ نا قابل انکار صداقت کہ اس کتاب حق کے انوار کی تجلیاں جب تمام قسم کی غلاظتوں میں ملوث صحرا نشینوں اور گلہ بانی کرنے والے عربوں کے اذہان وقلوب پر پڑیں تو ان کے اندر سیادت وقیادت کا وہ ملکہ پیدا ہو گیا جس کی مثال تاریخ نہ پیش کرسکی۔ قرآنی عظمت وجلال کا یہ فکری پہلو ہے۔ مقصد کی عظمت و بلندی، موضوعات کی بوقلمونی، پیشین گوئیوں کی صداقت، تاریخی حقائق کا حسن بیان اور قصص و واقعات کی اثر آفرینی اور بے مثل فصاحت و بلاغت قرآن مجید کی عظمت کے وہ درخشاں ادبی پہلو ہیں اور بلاشبہ اس کا ہر ہر پہلو رفیع الشان اور بے مثل اعجازی کردار کا حامل ہے۔ ہاں قرآن مجید کا اصل اور ثابت شدہ اعجاز اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت میں مضمر ہے، کیونکہ نزول قرآن کے وقت مخاطب معاشرہ اپنی زبان دانی پر نازاں و فاخر تھا اور اس نے اس ادبی شہ پارے کے مثل پیش کرنے سے متعلق پے در پے قرآنی چیلنجز کے سامنے سپر ڈال دیا تھا، یہاں تک کہ زبان و بیان کے دقیقہ شناس عربوں نے عقل وفکر کا توازن کھو کر کبھی اسے شعر و شاعری سے تعبیر کیا تو کبھی ساحری سے اور کبھی اسے جنون کی طرف منسوب کیا تو کبھی کاہنوں کی طرف۔

مستشرقین نے فکر وفن، دونوں کے اعجازی پہلوؤں پر علم وتحقیق کا بیڑا اٹھایا ہے، انگریزی زبان میں اسلام، قرآن اور سیرت پر لکھنے والے مغربی علماء کی ایک طویل فہرست ہے لیکن راقم نے اس مقالے میں اعجاز قرآن سے متعلق آرتھر، جان، آربری، فلپ کے ہٹی، الفرڈ گیام، رینالڈ الین نکلسن اور ڈی ایس، مارگولیتھ کی تحریروں کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔

بلاشبہ یہ حضرات استشراق کی دنیا میں شہرت کی بلندی پر کمندیں ڈالے ہوئے ہیں لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ بعض کے علاوہ بیشتر حضرات قرآن مجید کی عظمت پر گویائی کرتے ہوئے غلطاں و پیچاں نظر آتے ہیں اور ان کی تحریریں شک و ریب، تردد وتذبذب اور تضاد وتناقض کا مرقع پیش کرتی ہیں، جس سے مغرب کے صاحبان علم و دانش کی شخصیتیں مخدوش ہو جاتی ہیں، تاہم بعض ایسے علمائے مغرب بھی ہیں جنہوں نے استشراق کی مخصوص ڈگر سے ہٹ کر بیشتر امور و مباحث میں علم وتحقیق کی شاہراہ اختیار کی ہے اور قرآنی اعجاز کے مختلف

پہلوؤں پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے محقق و مستند حیثیت، لاثانی و بے نظیر اسلوب نگارش اور بے مثل فصاحت و بلاغت کو بالخصوص شرح و بسط کے ساتھ حوالہ ناظرین کیا ہے، جن کی تحسین و پذیرائی بہرحال علمی دیانت داری کا تقاضا ہے۔

حوالے وحواشی

(۱) الاسراء: ۸۸۔ (۲) ق: ۲۔ (۳) الانبیاء: ۵، الصافات: ۳۶، الطور: ۳۰۔ (۴) البقرہ: ۱۰۲، المائدہ: ۱۱۰، یونس: ۷۶، الانبیاء: ۳، سبا: ۴۳، المدثر: ۲۴۔ (۵) الانعام: ۲۵، الانفال: ۳۱، النحل: ۲۴، المومنون: ۸۳۔ (۶) الاعراف: ۱۸۴، المومنون: ۲۵، ۷۰۔ (۷) سی، ٹی، اوریئنس: دی سنتارٹر آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، ج ۲، ص ۱۴۶۵، طبع سوم۔ (۸) سی، ٹی، اوریئنس: ج ۲، ص ۱۴۶۵۔ (۹) ایڈورڈ سعید: اوریئنٹلزم، ص ۲۰۳، ۱۹۷۸ء، یو، ایس، اے۔ (۱۰) علامہ شبلی: سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۵۸، ۱۹۸۲ء، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ (۱۱) ایڈورڈ سعید: اوریئنٹلزم، ص ۲۰۳۔ (۱۲) اے، جے، آربری: ریویلیشن اینڈ ریزن ان اسلام، ص ۱۱، طبع ۱۹۶۵ء، گریٹ برٹین۔ (۱۳) اے، جے، آربری: دی ہولی قرآن۔ این انٹروڈکشن ودسیکیلنشن، ص ۳۳، ۱۹۵۳ء، لندن۔ (۱۴) اے، جے، آربری: دی ہولی قرآن۔ این انٹروڈکشن ودسیکیلنشن، ص ۲۷۔ (۱۵) اے، جے، آربری: دی قرآن۔ انٹرپریٹیڈ، ج ۱، مقدمہ، ص ۲۴، ۱۹۵۵ء، لندن۔ (۱۶) اے، جے، آربری: دی ہولی قرآن۔ این انٹروڈکشن ودسیکیلنشن، ص ۲۸۔ (۱۷) فلپ، کے، ہٹی: اسلام۔ اے وے آف لائف، ص ۲۷، ۱۹۷۰ء، آکسفورڈ یونیورسٹی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، آکسفورڈ۔ (۱۸) فلپ، کے ہٹی: ہسٹری آف دی عربس، ص ۱۲۵، طبع نہم، ۱۹۶۸ء، نیویارک۔ (۱۹) الفرڈ گیام: اسلام، ص ۵۵، نظرثانی شدہ ایڈیشن، ۱۹۵۶ء، گریٹ برٹین۔ (۲۰) الفرڈ گیام: اسلام، ص ۵۵۔ (۲۱) الفرڈ گیام: دی قرآن، اسلام، ص ۱۸۹۔ (۲۲) رینالڈ الین نکلسن: اے لٹریری ہسٹری آف دی عربس، ص ۱۴۳، ۱۹۵۶ء، کیمبرج یونیورسٹی پریس۔ (۲۳) ڈی، ایس، مارگولیتھ: محمڈنزم، ص ۵۱، ۱۹۱۵ء، لندن۔ (۲۴) ایضاً، ۶۳۔ (۲۵) ایضاً، ص ۲۴۵۔ (۲۶) ایضاً۔

تذکرہ ید بیضا کا تنقیدی جائزہ اور قلمی نسخوں کی تفصیلات

ڈاکٹر زرّینہ خان

حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی اٹھارہویں صدی عیسوی کے ان علمائے گرامی میں سے ہیں، جن کا نام علم وادب کی تاریخ میں نمایاں ہے، وہ عالم وفاضل، ادیب، تذکرہ نگار اور محقق ہی نہیں بلکہ فن شعر گوئی اور تاریخ میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس کی شاہدان کی متعدد تصنیفات ہیں جو عربی اور فارسی زبان میں موجود ہیں۔ ''ید بیضا'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کے تنقیدی مطالعہ سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آزاد بلگرامی کے مختصر سوانح ید بیضا اور دوسری تصنیفات کے حوالہ سے نقل کر دیے جائیں تاکہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو جلوہ گر ہو کر سامنے آجائیں۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی کی ولادت ۲۵/صفر، یکشنبہ ۱۱۱۶ھ میں محلّہ میدان پورہ، قصبہ بلگرام، ضلع ہردوئی، صوبہ اتر پردیش میں ہوئی (۱)، ان کے والد میر محمد نوح تھے۔ ان کا سلسلہ نسب عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید امام زین العابدین تک پہنچتا ہے۔ جیسا کہ خود آزاد بلگرامی کہتے ہیں:

گرچہ موتم الاشبال عیسیٰ جد من
عیسیٰ جان بخش شیرانم بامداد نفس(۲)

آزاد نے ابتدائی تعلیم نانا میر عبد الجلیل بلگرامی سے حاصل کی، ان کے علاوہ مولانا الشیخ محمد حیات السندالمدنی اور شاہ لُدھا بلگرامی بھی ان کے استادوں میں تھے۔

شعبۂ فارسی، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ۔

آزاد نے متعدد سفر کیے۔سب سے پہلے ۱۱۳۴ھ (۳) میں میر عظمت اللہ بلگرامی کے ہمراہ شاہ جہاں آباد ملازمت کے حصول کے لیے اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی کے پاس گئے۔ دوسرا سفر ۱۱۴۲ھ (۴) میں سیستان، ملتان، لاہور ہوتے ہوئے جہان آباد کا کیا تھا۔ جہاں وہ اپنے ماموں سید محمد بلگرامی سے ملے اوران کے یہاں چار سال قیام کیا۔اسی سفر کے دوران ان کی ملاقات شیخ علی حزیں سے ۱۱۴۷ھ میں بھکر کے مقام پر ہوئی۔شیخ علی حزیں آزاد کے ہم عصر اور اعلیٰ پائے کے شاعر تھے، ان کا ذکر ید بیضا میں موجود ہے۔انہوں نے آزاد کو اپنی غزلوں کا دیوان بطور تحفہ دیا۔تیسرا سفر (۵) آزاد نے ۱۱۵۰ھ میں حج بیت اللہ کا کیا۔وہ دوسال بعد مکہ معظّمہ سے واپس آئے۔

زندگی کے آخری ایام میں آزاد اورنگ آباد دکن میں مقیم ہوگئے تھے، گوشہ نشینی کی حالت میں ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی اور خلد آباد میں دفن ہوئے۔تذکرہ نویسوں اور نقادان سخن نے انہیں متفقہ طور پر عالم و فاضل اور فن شعر وسخن میں ماہر و قادر گردانا ہے۔ان کو عربی اور فارسی زبان پر یکساں قدرت حاصل تھی، انہوں نے بہت سی کتابیں، شعراء کے متعدد تذکرے اور دواوین عربی وفارسی زبان میں یادگار چھوڑے ہیں۔

ید بیضا کے ذکر سے پہلے آزاد بلگرامی کے دوسرے فارسی تذکروں سے متعلق اطلاعات قارئین تک پہنچانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ایک تذکرہ فارسی شعراء، فقراء اور فضلاء کا ترتیب دیا، جو کافی ضخیم ہوگیا، اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ پہلا حصہ ''مآثر الکرام فی تاریخ بلگرام'' کے نام سے موسوم ہوا جس میں بلگرام کے فقراء اور فضلاء کا ذکر ہے۔دوسرے حصے کا نام ''سروآزاد'' رکھا۔ اس میں ۱۰۰۰ھ سے اپنے عہد تک کے تقریباً ۱۴۳ فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے۔یہ تذکرہ ۱۱۶۶ھ میں تالیف ہوا۔ ۱۱۷۶ھ میں آزاد بلگرامی نے ایک اور تذکرہ شعرا بنام ''خزانہ عامرہ'' تالیف کیا جس میں ان شعراء کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی بادشاہ، شہزادہ، امیر یا کسی منصب دار کے دربار سے وابستہ اور انعام یافتہ تھے۔صوفیوں کا ایک تذکرہ ''روضۃ الاولیاء'' کے نام سے تالیف کیا ہے۔

تذکرہ ید بیضا کا تنقیدی جائزہ: تذکرہ ید بیضا، آزاد بلگرامی کا اولین فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔یہ ۱۱۴۸ھ میں تالیف ہوا، اس میں ابتداء سے اپنے عہد تک کے تقریباً ۱۲۵۴ فارسی

شعراء کا ذکر ہے۔

مقدمے میں حمد و نعت کے بعد وجہ تصنیف بیان کرتے ہیں، ''عرصے سے خواہش تھی کہ متقدمین و متاخرین شعراء کا تذکرہ ترتیب دیا جائے، اس سلسلے میں مواد کی جمع آوری شروع کی اور اشعار کے ذخیرے جمع کیے۔ ''لاجرم قسمی از روشن طبعان متقدمین و پرتو از آتش نفسان متاخرین دریوزہ کردم و لمعۂ چند از تجلیگاہ سخن بدست آوردم۔ آن کلمات روشن آیات را بر بیاض صفحات چوں خطوط شعاعی بر سپیدۂ صبح نگاشتم و آن مسودہ نورانی را ''ید بیضا'' نام گذاشتم''۔ تذکرے کی تاریخ تالیف خود آزاد نے طبع کلیم ید بیضا نمود ۱۱۴۸ھ لکھی ہے (۶)۔ تذکرے میں اسلوب یہ اختیار کیا ہے کہ پہلے ان شعراء کا تخلص، پورا نام، تاریخ ولادت اور وفات (اگر معلوم ہوئی)، مہمات اور آخر میں شاعر کے دیوان یا کلیات سے اشعار کا عمدہ انتخاب پیش کیا ہے۔ بقول آزاد:

> ''لہٰذا خاصہ عنبرین شمامہ را از تکلف عبارات و تصلف استعارات معاف داشتم و بامراد اشعار معدودہ و افکار ستودہ اکتفا نمودہ قصاید و مثنویات و غزلیات مطولات ادا گذاشتم''۔ (۷)

شعراء کے احوال زندگی کے متعلق مواد کی فراہمی میں آزاد بلگرامی نے کافی محنت، مشقت اور عرق ریزی کی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے مختلف کتابوں، تذکروں اور تاریخی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، مستفاد مآخذ میں تاریخ صبح صادق، آئین اکبری، مصنف شیخ فیضی، گلزار ابرار، مصنف شیخ محمد مندوی، تذکرہ ناظم تبریزی، نفحات الانس جامی، تاریخ عالم آرائی عباسی، تذکرہ کلمات الشعراء، مصنف محمد افضل سرخوش، تذکرہ عرفات العاشقین، مولف تقی اوحد الدین، سفینۂ بے خبر، مصنف عظمت اللہ بے خبر، شاہ جہاں نامہ، مصنف عبدالحمید وغیرہ کے نام نقل کیے ہیں۔ جن شعراء سے آزاد ذاتی طور پر واقف تھے ان میں بلگرام کے شعراء بھی شامل ہیں، ان کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات دلکش انداز میں بیان کیے ہیں اور شعراء سے متعلق اہم اور مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اکثر شعراء سے متعلق جو اطلاعات ید بیضا میں فراہم کی گئی ہیں وہ دوسرے تذکروں میں ہم کو نہیں ملتی ہیں۔

آزاد بلگرامی کی کنج کاوی اور دقیق نظری کی زندہ مثال وہ مقام ہے جہاں ید بیضا کے مقدمے میں انہوں نے فارسی کے اولین شاعر اور اولین موزوں کلمات پر بحث کی ہے اور عربی وفارسی کی مختلف کتابوں، احادیث و روایات اور کتب تواریخ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قدیم زمانے سے شعرگوئی کا رواج تھا اور اول فارسی کا شاعر کون تھا۔ آزاد مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''اول کسی کہ جواہر سخن را در رشتۂ نظم کشیدہ واین تحفہ موزوں را از خزانہ غیب بقلمر وشہود رسانید آدم علیہ السلام است''۔

اس ضمن میں فرزند آدم قابیل کے ہاتھوں بھائی ہابیل کے قتل کا ذکر کیا ہے اس وقت حضرت آدمؑ کے منھ سے جو موزوں کلمات مرثیہ کی صورت میں ادا ہوئے تھے۔ ابن اثیر کی کتاب کے حوالے سے نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضورؐ اشعار سنتے تھے اور کبھی کبھی تبسم فرمایا کرتے تھے، اس ذیل میں آپؐ کے مدح گو شاعر حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت کعب بن زہیرؓ کے قصیدہ ''بانت سعاد'' کا ذکر بھی کیا ہے۔

تعجب ہے کہ آزاد بلگرامی کی اطلاعات و معلومات فارسی کے پہلے شاعر کے متعلق جدید مورخین کی آرا سے کافی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ جدید مورخین و ناقدین بھی عباس مروزی اور ابوحفص سعدی کو فارسی کے اولین شاعر کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ آزاد بلگرامی بھی عباس مروزی کا وہی قصیدہ نقل کرتے ہیں جو عبدالوہاب قزوینی اور ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے تاریخ ادبیات ایران میں نقل کیا ہے، قصیدے کا مطلع درج ذیل ہے۔

ای رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرق دین
گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین(۸)

ایک دوسری روایت کے مطابق فارسی کا پہلا شاعر ابوحفص سعدی تھا۔ آزاد بلگرامی نے اس کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے یہی شعر تاریخ ادبیات ایران میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ شعر درج ذیل ہے۔

آھوی کوھی در دشت چگونہ دودا

دو ندارد یار بے یار چگونہ رودا

ابوحفص سعدی خلیفہ مامون کے عہد کا شاعر تھا، یہ واقعہ ۱۹۳ھ کا ہے(۹)، بقول آزاد:

''الحاصل تا حدود ثلث مأتہ ۳۰۰ھ شرذمہ قلیل اندک اندک شعر گفتہ بودند اما کسی تدوین نکردہ۔ اما در عہد سلاطین سامانیہ استاد رودکی پدید آمد کہ دیوان شعر مرتب گردانید اوراق پریشاں را در رشتۂ شیرازہ کشیدہ و بہر ودو ہوا پایہ سخن رسید بجای کہ رسید''۔(۱۰)

آزاد رودکی کو پہلا صاحب دیوان شاعر مانتے ہیں فارسی کے پہلے شعرا اور اولین شاعر کی بحث کو آزاد اپنے اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

رنگینی حسن سخن ہر لحظہ افزوں میشود

ہر چند آمد در نوا ایں نغمہ موزوں میشود

مقدمے کے بعد شعراء کا تذکرہ شروع ہوتا ہے، شعراء کے نام الف بائی ترتیب سے دیے ہیں۔ حرف الف محمد افضل الدین کاشانی کے ذکر سے شروع اور حرف ی میر محمد یوسف بلگرامی کے ذکر پر ختم ہوتی ہے۔

شعراء کے احوال و کوائف لکھتے وقت آزاد نے ممکنہ وسائل کا استعمال کیا ہے۔ شاعر کے متعلق ذاتی نوعیت کے واقعات نقل کیے ہیں۔ حرف الف میں آذری اسفرائنی کے متعلق لکھتے ہیں:

''بعد زیارت حرمین شریفین بسیر ہند شتافت و با سلطان احمد شاہ بہمنی در دکن پیوست''۔(۱۱)

سلطان نے شہر بیدر کی بنیاد ڈالی اور دارالامارۃ کی تعمیر کرائی۔ شیخ آذری نے چند ابیات نظم کر کے سلطان کی نذر کیے۔

حبذا قصر مشید کہ زفرط عظمت

آسمان پایہ از سدۂ ایں درگاہ است

آسمان ہم نتواں گفت کہ ترک ادب است
قصر سلطان جہاں احمد بہمن شاہ است(۱۲)

آزاد سے پہلے اور خود ان کے زمانے میں تذکرہ نویس، شعراء کے کلام پر برائے نام نقد کرتے تھے، مختصر ذکر اور اشعار کے انتخاب پر اکتفا کرتے تھے۔ آزاد نے اس روایت کو توڑا اور اکثر شعراء کے کلام کو میزان تنقید پر پرکھ کر نہ صرف شاعر کے کلام کے متعلق اپنی آرا لکھی بلکہ دوسرے شعراء کی رائے بھی مع مثال کے نقل کی۔ مرزا جلال اسیر کے متعلق آزاد رقم طراز ہیں:

''شاعر ادا بند است و موجد انداز ہای دلپسند''۔ (۱۳)

یہاں اپنے خیال کی تائید کے لیے ابو طالب کلیم کا شعر نقل کیا ہے، جس میں کلیم نے اسیر کی شاعرانہ استعداد کو تسلیم کیا ہے۔

مرزای ما جلال الدین بس است
از سخن سنجان طلبگار سخن
راستی طبعش استاد من است
کج نہم برفرق دستار سخن(۱۴)

مزید ثبوت بہم پہنچانے کے لیے مرزا صایب تبریزی کا شعر بھی نقل کیا ہے۔ جس میں انہوں نے اسیر کے تتبع کا اعتراف کیا ہے۔

خوشا کسی کہ چو صایب ز صاحبان سخن
تتبع سخن میرزا جلال کند(۱۵)

صایب اور اسیر ہم عصر تھے، اسیر، صایب سے بے حد متاثر تھے، فصیحی ہروی کے شاگرد ہونے کے باوجود انہوں نے صایب سے اپنی حد درجہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اسیر کا شعر ملاحظہ ہو۔

باوجود آنکہ استادم فصیحی بودہ است
مصرع صائب تواند یک کتاب من شود(۱۶)

اسی طرح اوجی کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ صایب تبریزی ان کی شاعرانہ صلاحیت کا

اعتراف اوران کے اشعار پر تضمین کرتے تھے۔

این جواب مصرع او جی کہ وقتی گفتہ است
پادشاہی عالم طفلی است یا دیوانگی

حرف الف کے اختتام پر آزاد بلگرامی نے خود اپنے کلام کا طویل انتخاب بھی پیش کیا ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آزاد شعر گوئی میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور شعر کی ہر صنف پر انہیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔غزل ان کا خاص میدان اور وہ اس کے شہسوار تھے، ان کی شعر گوئی کے چند نمونے نذر قارئین ہیں۔

ھمان آغاز باشد منتہای سیر کامل را
تمنا می کند بار دگر غواص ساحل را
نرگس او بجا کشید سرمۂ دلپذیر را
خوب کمند وحدت است مردم گوشہ گیر را

آزاد کے صوفیانہ رنگ میں ڈوبے اشعار قابل تحسین اوران کی فکر وفن کی پختگی کے ضامن ہیں۔ذیل کے اشعار میں آزاد نے صوفیانہ مطالب کو ضرب الامثال کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

اگرچہ خاک شدم ، اضطراب من باقی ست
کہ پیچ و تاب رسن ، بعد سوختن باقی ست

مندرجہ بالا شعر میں ضرب المثل ''رسی جل گئی بل نہیں گئے'' کونہایت پراثر اور خوبصورت انداز میں مہارت کے ساتھ برجستہ پرویا ہے اور گہرے معنی پیدا کیے ہیں۔

ریاضتی کش و دریاب لذت عرفان
کہ آب را مزۂ خوش بقدر تشنہ لبی است

درج بالا شعر میں کہتے ہیں عبادت وریاضت سے عرفان کی لذت حاصل کرنا چاہیے۔ عرفان کی پہلی منزل ''طلب'' ہے، پیاس ہے۔اس بات کونہایت برجستہ، واضح اور عام فہم مثال دے کر قاری کو ذہن نشین کرایا ہے۔پانی خوش مزہ تب لگتا ہے جب پیاس بڑھی ہوتی ہے،طلب

جتنی شدید ہوگی عبادت، ریاضت اور مجاہدہ بھی اسی کے بہ قدر زیادہ کرنا ہوگا۔

آزاد نے اکثر اشعار میں دنیا سے بے گانگی، بے رغبتی اور دنیاوی اشیاء سے بے نیازی کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں۔

زده ام برسر جهان پاپوش
بی سبب این برهنه پائی نیست(۱۷)

حرف ب کے تحت بدر چاچ کے ذکر میں آزاد لکھتے ہیں:

''در پایان عمر بهند خرامید و مشمول فراوان عنایت ورعایت سلطان محمد تغلق شاه گردید و به فخر زمان مخاطب گشت''۔(۱۸)

بدر چاچ نے عرصہ تک ہندوستان میں قیام کیا اور پھر واپس اپنے وطن چلا گیا۔

باذل رفیع خان کے ذکر میں اس کے والد اور چچا کا تذکرہ مفصل ہے مگر خود باذل کے حالات مختصراً لکھے ہیں۔ اس کی مثنوی ''حملہ حیدری'' سے دو ابیات نقل کیے ہیں۔ مرزا عبدالقادر بیدل کا ذکر خاصہ طویل ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں بیدل محمد اعظم بن خلد مکان اورنگ زیب کی ملازمت میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ ایک مصاحب نے شہزادے سے بیدل کی شعر گوئی کی تعریف کی تو شہزادے نے اپنی شان میں قصیدہ لکھنے کی فرمائش کردی، اس کی یہ فرمائش بیدل کی خودداری پر تازیانہ ثابت ہوئی اور نوکری سے استعفا دے کر گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ بیدل کی شاعرانہ صلاحیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ نواب نظام الملک آصف جاہ اپنے اشعار کی اصلاح ان سے کرواتا تھا اور شاگردی کو باعث فخر سمجھتا تھا۔ بیدل کے سید برادران سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خان سے اچھے مراسم تھے اور سید حسین علی خان کی شان میں ابیات بھی کہے ہیں۔ سید برادران تاریخ میں ''بادشاہ گر'' کہلاتے ہیں۔ بادشاہ محمد فرخ سیر سے سید برادران کے انحراف کے بعد مرزا نے یہ تاریخ لکھی ''سادات بوی نمک حرامی کردند'' ۱۱۳۱ھ۔(۱۹)

بے خبر میر عظمت اللہ کے تذکرے میں بیدل نے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ یہ ملاقات اتفاقاً ہوگئی اور اسی مختصر سی ملاقات میں بیدل نے کہا ''ای صاحب بعد مدتی ہم چوشما

ہمرنگ رایافتہ ایم'' (۲۰) اور بطور یادگار تین ابیات نذر کیے۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں ''جمعی (۲۱) کہ قدم سعی باین دیار نفرسودہ اند و غایبانہ تحفہ گراں مایہ مدح ارسال نمودہ''۔ یہاں آزاد بلگرامی مولانا جامی اور حافظ شیرازی کا ذکر کرتے ہیں جو ہندوستان نہیں آئے لیکن اپنے ارمغان مدائح بھیجتے تھے۔ مولانا جامی کو ملک التجار خواجہ محمود گاوان، امیر الامراء سلطان محمد شاہ بہمنی والی دکن سے خاص ربط و تعلق تھا اور انہیں اپنے اشعار کا تحفہ بھیجتے تھے۔ آزاد نے ایک قصیدہ نقل کیا ہے جس کا مطلع ملاحظہ ہو۔

ہم جہاں را جوابہ وہم فقر را دیباچہ است
سر الفقر است لیکن تحت استاذ الغنا

ایک غزل کے خاتمہ میں جامی نے ملک التجار کا نام لیا ہے۔

جامی اشعار دلآویز تو جنسی است لطیف
بودش از حسن ادا لطف معانی تارش
ہمرہ قافلہ ہند روان کن کہ رسد
شرف مہر قبول از ملک التجارش (۲۲)

حرف حاء میں حافظ شیرازی کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں میر فضل اللہ صدر سلطان بہمنی نے حافظ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ حافظ نے بصد شوق قبول کی اور ارادہ سفر سے بندر ہرمز پر پہنچے مگر سمندر میں تلاطم برپا دیکھ کر سفر ملتوی کر دیا اور ایک غزل بطور ارمغان ارسال کی۔ حافظ کی مشہور غزل کا مطلع درج ذیل ہے۔

دمی باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد

یہ واقعہ تاریخ صبح صادق کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ حافظ کو سلطان غیاث الدین والی بنگالہ سے خاص تعلق تھا اور وہ اسے اپنی غزلیں تحفۃً بھیجتے تھے۔ ان کی غزل کے دو ابیات نقل کیے ہیں جو غیاث الدین کو بھیجی تھی۔

شکر شکن ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین
غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود (۲۳)

امیر خسرو دہلوی کا ذکر خاصہ طویل اور تفصیلی ہے اس میں تاریخی کتب کے حوالے سے ذاتی نوعیت کے واقعات نقل کیے ہیں ۔ امیر خسرو کو اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء سے نہایت عقیدت اور لگاؤ تھا ۔ پیر و مرشد بھی خسرو کو بے حد محبوب و عزیز رکھتے تھے اور انہیں محبت سے ''ترک اللہ'' کہہ کر پکارتے تھے ۔ خسرو کے کلام میں رقت، دردانگیزی اور سوز کیسے آیا اس کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:

''شیخ آب دہن خود را در دہن وی افگند چنانچہ درد سپہر می آرد''۔ (۲۴)

خسرو کی تمام مثنویات کا ذکر کیا ہے مثلاً مطلع الانوار، سکندر نامہ، لیلیٰ مجنوں، خسرو شیریں، قران السعدین، نُہ سپہر وغیرہ اوران مثنویات سے اشعار بھی نقل کیے ہیں ۔

زلالی خوانساری کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ان کی مثنوی ''محمود و ایاز'' ۱۰۰۱ھ میں شروع اور ۱۰۲۴ھ میں ختم ہوئی لیکن زلالی کی زندگی میں یہ مکمل نہیں ہو پائی ۔ نقی کمرہ ای کے داماد اس مثنوی کے متعدد نسخے ہندوستان لائے اور ملا طغرا نے نثر میں اس کا دیباچہ لکھا اور اس طرح یہ مثنوی مکمل ہوئی ۔

میرزا صایب تبریزی کے ذکر میں بے خبر بلگرامی کے ''تذکرہ سفینۂ بے خبر'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ میرزا صایب سے میر عبدالجلیل بلگرامی (آزاد کے نانا تھے) کی ملاقات ہوئی تھی اورانہیں صایب سے قربت حاصل تھی ۔ صایب کو میرزا محمد مراد لائق جونپوری سے بھی خاص تعلق تھا ۔ لائق صایب سے ملاقات کے اس قدر شیدا تھے کہ پیدل اصفہان گئے اور عرصے تک قیام کے بعد ہندوستان واپس آئے ۔

طبیعت شیخ سیف الدین محمد کو آزاد نے میر عبدالجلیل بلگرامی کا شاگرد بتایا ہے۔ انہوں نے علوم وفنون اور عربی و فارسی نثر میں مہارت و دستگاہ حاصل کی تھی۔ آزاد نے خود طبیعت سے الٰہ آباد میں ملاقات کی تھی۔ ملاظہوری ترشیزی کے متعلق صایب کا شعر نقل کیا ہے جس میں صایب نے ظہوری کی سخن دانی کا اعتراف کیا ہے۔

صایب نداشتیم سر و برگ ایں غزل
ایں فیض از کلام ظہوری بما رسید (۲۵)

تاریخ صبح صادق کے حوالے سے عرفی شیرازی کے متعلق ایک واقعہ نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

''عرفی نے بادشاہ اکبر کے دربار تک رسائی کی خاطر بیرم خان خاناں سے ربط پیدا کیا اور اپنے اشعار انہیں دیے۔ عرفی کی وفات کے بعد خان خاناں نے ایک شخص کو وہ اشعار دیے کہ اس کو جمع کر کے کتاب کی شکل میں لائے۔ اس شخص کی نیت خراب ہوگئی اور وہ فرار ہوگیا۔ اتفاقاً مولف صبح صادق کو وہ شخص بندرگاہ پر مل گیا اور اس نے وہ اشعار زبردستی اس شخص سے حاصل کر لیے۔ یہ تقریباً پندرہ ہزار اشعار تھے۔ ان اشعار میں سے ایک شعر نذر قارئین ہے''۔

عاشق ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

(باقی)

پاورقی

(۱) ید بیضا (مخطوطہ)، ص ۱، ۲۔ (۲) ایضاً، تذکرہ سرو آزاد (مطبوعہ)، ص ۲۹۳۔ (۳و۴) ایضاً، خزانۂ عامرہ (مطبوعہ)، ص ۱۲۵، شجرۂ طیبہ (مخطوطہ)، ص ۲-۲۰۱۔ (۵ تا ۱۰) مخطوطہ ید بیضا (مقدمہ)، ص ۵، ۴، ۳، تاریخ ادبیات ایران، ص ۵۱-۵۰۔ (۱۱ تا ۲۰) تذکرہ ید بیضا (مخطوطہ)۔ (۲۱ تا ۲۵) ایضاً۔

عصر حاضر میں تعمیری ادب کی معنویت

ڈاکٹر محمد شارق

اردو زبان وادب ایک ہمہ گیر اور وسیع موضوع ہے، عالمی ادب میں اردو ادب کو ایک اہم مقام حاصل ہے، ادب کا اطلاق ایسی تحریروں پر ہوتا ہے جن میں زندگی کے تجربات و مشاہدات نیز انسانی جذبات و احساسات وغیرہ کو بڑے ہی دلکش اور موثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے، اگر ادب کو وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو ہر منظّم تحریر اس میں شامل ہوسکتی ہے، خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو، جیسے سائنسی ادب، سیاسی اور مذہبی وغیرہ۔

ایسے ہی ادب کی اور بھی تعریف لوگوں نے کی ہے، مثلاً سادہ اور مختصر زبان میں اس کی تعریف یوں بھی کی جاتی ہے کہ سلیس زبان اور موثر الفاظ میں کوئی بات کہی یا لکھی جائے۔

اور بالفاظ دیگر ادب نام ہے احساسات کو لفظوں کی شکل میں ڈھالنے کا اپنے کسی تصور کو جب ہم قابل فہم اشاروں میں تبدیل کردیتے ہیں تو اسی کو ادب کہا جاتا ہے، انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی چیز کا تصور اس کے ناموں کی مدد سے کرتا ہے......ادب کی اس تعریف کو سامنے رکھنے کے بعد یہ سمجھنا خود بخود آسان ہوجاتا ہے کہ بہتر ادب کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے۔(۱)

ادب کی ضرورت واہمیت: ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے گرد و نواح میں پیش آنے والے حالات اور واقعات سے ہر حالت میں متاثر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ادب کا مطالعہ کرنے سے ہمیں خطے کے سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی اور تہذیبی حالات سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ۔

ادب کے لیے لازم صلاحیتیں: ایک بہتر ادب کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- قوت اظہار یعنی زبان و بیان پر ایسی قدرت ہو کہ ضرورت کے وقت وہ موزوں الفاظ پالے۔ ۲- وسعت مطالعہ، وسعت مطالعہ اور ذوق مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کو ذہنی خوراک ملے اور اس کے تجربات روز افزوں ہوں، جیسے ایک کامیاب تاجر کو اس کا وسیع تجربہ اس کے کاروبار میں معاون و ممد ثابت ہوتا ہے۔ ۳- شدت احساس کا ملکہ ہو، اس کے ذریعہ ادب میں جان پیدا ہوتی ہے اور ایک حساس دل جس میں شدت احساس نہ ہو وہ دل دلِ زندہ کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا۔

صحیح ادب اسی وقت پروان چڑھ سکتا ہے جب کہ آدمی کا مطمح نظر بلند ہو اور اس صلاحیت میں جلا بخشنے کے لیے ادیب کو اپنا خون جگر جلانا پڑتا ہے اور برسوں کندن بننے کے لیے لوہے کی طرح بھٹی میں جلنا پڑتا ہے۔

سارا کلیجہ کٹ کٹ کے جب اشکوں میں بہہ جائے ہے
تب کوئی فرہاد بنے ہے تب شیریں کہلائے ہیں (حفیظ میرٹھی مرحوم)

ادب برائے ادب اسی وقت بن سکتا ہے جب اس میں مندرجہ ذیل جذبہ کارفرما ہو:

''جس ادب میں ادیب کی شخصیت شامل نہ ہو وہ ادب نہیں بساطی کی دوکان ہے جہاں آدمی ان چیزوں کو بیچتا ہے جن کو وہ خود استعمال نہیں کرتا، میں ادب کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہوں ایک مقصدی ادب اور چھپنے والا ادب، جہاں تک دوسرے ادب کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اس کے لیے صرف ایک شرط درکار ہے اور وہ آدمی کا یہ جذبہ کہ: بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے''۔ایضاً۔(۲)

ادب کی قسمیں: اثرات و نتائج کے اعتبار سے ادب کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں:

۱- تعمیری ادب۔ ۲- تخریبی ادب۔

تعمیری سے مراد ایسی تمام ادبی نگارشات ہیں جو مثبت نتائج اور ایک صالح معاشرہ کے وجود کا ذریعہ بنیں اور صحیح طرز فکر، پاکیزہ نظریۂ حیات کی نشو ونما کی آبیاری کرنے والی ہوں۔

اردو کے عناصر خمسہ میں سرسید، شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر اور محمد حسین آزاد شامل ہیں، ان

ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے ان کی نگارشات کی حیثیت ادبی دنیا میں سنگ میل کی سی ہے، مثلاً سرسید کا تہذیب الاخلاق اپنے زمانے کا ایک معیاری اور اصلاح معاشرہ پر مبنی رسالہ تھا، علامہ شبلی نعمانیؒ نے جو کچھ لکھا ہے چاہے وہ الفاروقؓ ہو یا سیرۃ النبیؐ یا دیگر کتابیں سب ادب کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہیں، مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری، حیات جاوید، مسدس حالی وغیرہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ ادب کا ایک اعلیٰ شاہکار ہے۔

مولانا شبلی نے سرسید کی زبان وادب وانشاء پردازی کی خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''سرسید کی انشاء پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچایا کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے''۔(۳)

سرسید مرحوم نے مولانا حالی کی زبان وادب پر مہارت کا اعتراف بڑے واضح الفاظ میں کیا ہے، چنانچہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''لیکن جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں، جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے مولانا حالی ہی کا کام ہے''۔(۴)

ایسے ہی ڈپٹی نذیر کی کتابیں مثلاً ''ابن الوقت''، ''مرأۃ العروس''، ''بنات النعش'' اور مولانا محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' وغیرہ ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، مولانا شبلی کا یہ جملہ ''بخدا اگر وہ گپیں بھی ہانک دیں تو وحی معلوم ہوتی ہے''۔ زبان زد خاص وعام ہے۔

ادب کی مثال دودھاری تلوار کی سی ہے: ادب کی مثال دودھاری تلوار کی سی ہے اگر یہ کسی صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو ایک انقلاب برپا کر دیتی ہے لیکن خدانخواستہ اگر کسی چنگیز اور ہلاکو کے ہاتھ لگ جائے تو انسانیت کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیتی ہے، آج عالمی طور سے جب ادب کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ہمیں ''تخریبی ادب'' سے واسطہ پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے

ہر جگہ انارکی، کرپشن اور فساد کا بازار گرم ہے اور آج تعلیم یافتہ لوگوں میں جو بگاڑ اور اخلاقی زوال پایا جاتا ہے، پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

معاشرہ پر ادب کے اثرات: ادب کا تعلق دراصل انسان کے وجود کے ذریعہ عمل میں آتا ہے اور انسان کے احساس کو متاثر کرتا اور جھنجھوڑتا ہے اور وجدانی صلاحیت وہ عطائے خداوندی ہے جو ہر انسان کو اس کے ظرف کے مطابق ودیعت کی جاتی ہے، خواہ محقق و مفکر ہو خواہ جاہل و عامی، بقول شخصے:

> ''ادب ایک طاقت ہے، ایک اثر انگیز ذریعہ ہے، ایک انسانی تقاضہ کا فطری جواب ہے''۔(۵)

غرض یہ کہ ادب کے اس غیر معمولی اثرات سے لوگوں نے مختلف قسم کے کام انجام دیے ہیں اور ہر دور کے ادباء و اہل قلم نے اپنے اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق دونوں طرح کی نگارشات (تعمیری و تخریبی) پیش کی ہیں، اے کاش آج اگر اہل علم و دانش اس موثر ذریعہ کا درست استعمال کرتے تو دنیا میں ہر طرف امن و امان قائم ہوتا اور انسانیت کو معراج کمال حاصل ہوتا، کیونکہ ہمارا ادب ہماری روایات و تہذیب کا امین و پاسبان ہے، ہماری اجتماعی امنگیں اور قومی عزائم اسی سے وابستہ ہیں اور ہمارا ماضی، حال اور مستقبل بھی اسی کے ذریعہ مربوط ہے اس لیے اردو کے معماروں اور ادیبوں کو اردو ادب کی طرف خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ قوم کی رہنمائی اور خدمت میں وہ موثر رول ادا کر سکیں۔

حکیم محمد سعید شہیدؒ معاشرہ کے لیے ادب میں شعراء و ادباء کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''شعر و ادب میں نت نئے تجربے کرنا ادیبوں اور شاعروں کا حق ہے، انہیں تجربات کرنے سے روکنا دراصل تخلیقی سوتوں کو خشک کرنے کے مترادف ہے لیکن ادیبوں اور شاعروں سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تجربات کو اپنے تہذیبی مزاج سے الگ کرنے کی کوشش نہ کریں''۔(۶)

ادیب کی تخلیقی آزادی اور معاشرہ میں اس کی اہمیت کے متعلق پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''کسی ادارے کے احکامات کی بجا آوری اور تخلیقی آزادی یا ضمیر کی آزادی کا اظہار ایک ساتھ ہمیشہ ممکن نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ ادیب اپنی صلاحیتوں کو، احساسات کو اور اپنے ہی تصور کی طرح انسانی ہمدردی کے تصور کو بھی دوسروں کا مطیع و ماتحت نہ بنادے''۔(۷)

آگے مزید تحریر کرتے ہیں:

''معاشرے میں ادیب اور آرٹسٹ کے رول کی وضاحت کرتے ہوئے کامیو نے کہا تھا کہ صرف مزاحمت یا تصادم سے اعلیٰ ادب نہیں پیدا ہوتا بلکہ اعلیٰ ادب ہمارے اندر مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے اور اقتدار سے دو دو ہاتھ کرنے کی استعداد پیدا کرتا ہے''۔(۸)

تعمیری ادب معاشرہ کی اصلاح کا باعث ہوتا ہے اور ہر طرح کی اخلاقیات کا اس کے ذریعہ سماج اور سوسائٹی میں فروغ ہوتا ہے، جبکہ تخریبی ادب سے معاشرہ میں فرضی خیالات میں پختگی پیدا ہوتی ہے لوگ تکلفات کے خوگر ہونے لگتے ہیں، خصوصاً ایشیا کے شعراء اس کے کچھ زیادہ ہی شکار نظر آتے ہیں بقول سرسید مرحوم:

''ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اصل صورت یا اصلیت و حقیقت کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں، جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف ہی نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہوجاتے ہیں''۔(۹)

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بے لوث لطیف جذبات اور پاکیزہ ذوق کی آبیاری ہو، نیز انسانیت کی فلاح و صلاح کا داعیہ پیدا کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

اس کے برعکس تخریبی ادب میں ایسی تمام ادبی نگارشات شامل ہیں جو خدا پرستی سے ہٹا کر الحاد کی دعوت دیتی ہوں اور نفلی جذبات مثلاً سماج میں فحاشی، بے حیائی اور جنسی انارکی کا داعیہ پیدا کرتی ہوں اور نیز تعصب و تنگ نظری، فرقہ وارانہ جذبات کو پروان چڑھاتی ہوں اور یاس و قنوطیت کا ماحول پیدا کرتی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ آج مثبت اور تخلیقی ادب معاشرہ میں پروان نہیں چڑھ رہا ہے بلکہ ادب کے نام پر بازاری چیزیں شائع کی جارہی ہیں اور مغرب سے درآمد ہر گلی سڑی چیز کو اتنی اہمیت دی جارہی ہے جس کی وہ ہرگز مستحق نہیں ہے، بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''ادب کے بارے میں وہی گلی سڑی، کچی پکی بحثیں اٹھائی جارہی ہیں جو نہ صرف مغرب میں فرسودہ اور بے معنی ہوچکی ہیں بلکہ جن کا ہماری تہذیب، ہمارے معاشرے اور نظام فکر سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ تبدیلی جو ہمارے معاشرے کے انسان کے اندر آتی ہے یا آرہی ہے، اس کا اظہار ادب میں نہیں ہورہا ہے، وہ نظام اقدار جس پر ہماری ثقافت کی بنیاد قائم تھی اب عام طور پر بے معنی اور فرسودہ ہوگیا ہے''۔(۱۰)

حالانکہ ادب انسانی زندگی کی پہچان کا ایک اعلیٰ وسیلہ ہے اور انسانی معاشرہ میں اس کی مثال ریڑھ کی ہڈی (Back Bone) کی سی ہے، یعنی جیسا ادب معاشرہ میں تخلیق ہوگا اسی کے مطابق معاشرہ ترقی کے منازل طے کرسکتا ہے، اس کے برعکس اگر وہ منفی تخلیق پر اپنا زور صرف کرے گا تو معاشرہ اسی اعتبار سے پستی اور نکبت سے دوچار ہوگا۔

مراجع

(۱) تعمیری ادب ''نثر''، فضل حسین، ص ۱۸۷، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ (۲) ایضاً، ص ۱۹۰۔ (۳) مقالات شبلی، ص ۲۵۲، شبلی اکیڈمی، ایڈیشن ۲۰۰۸ء۔ (۴) اردو تنقید کی تاریخ، ص ۱۹۵-۱۹۶، ڈاکٹر مسیح الرحمان، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ (۵) تعمیر حیات، لکھنؤ، مئی ۱۱ء۔ (۶) ادبی مقالات، حکیم محمد سعید شہید، ص ۴۶، ہمدم فاؤنڈیشن۔ (۷) اردو چینل ممبئی (۳۰)، ص ۱۴۳، ج ۱۳، ش ۳، ۴، اکتوبر ۱۱ء۔ (۸) ایضاً۔ (۹) اردو تنقید کی تاریخ، ص ۱۹۷۔ (۱۰) ادب کا بنیادی کام بحوالہ انقلاب ۳۰ رستمبر ۱۲ء۔

رپورٹ دوروزہ سیرت سمینار

کلیم صفات اصلاحی

علامہ شبلی نعمانیؒ نے دارالمصنّفین کی بنیاد ہی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر رکھی، قرآن مجید اور مستند احادیث کی روشنی میں واقعات سیرت کی تحقیق و تنقیح کا جو معیار و اسلوب امت کے سامنے علامہ شبلیؒ نے پیش کیا اور جس کی مکمل اتباع ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کی، وہی اصل میں اس ادارے کی سب سے بڑی خصوصیت اور وجہ امتیاز ہے، سیرت کی خدمات کے تسلسل میں وقت و ضرورت کے تقاضے کے مطابق ایک نئے سلسلہ کا اضافہ سیرت سمینار کی شکل میں کیا گیا ہے، قریب تین سال پہلے ''مصادر سیرت'' کے موضوع پر پہلا کامیاب سمینار منعقد کیا گیا تھا، اس بار ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی'' کے عنوان کے تحت ''خاندان نبوت، بنو عبد مناف، آبا و اجداد نبوی، قریش کے خاندانی روابط، قبائل عرب سے تعاون باہمی کے معاہدے، معجزات و دلائل نبوت پر تجزیاتی مطالعہ، بچپن سے عہد شباب تک کے اہم واقعات کا تجزیہ، حضرت خدیجہؓ کی تجارت کا تجزیاتی مطالعہ، اولاد نبوی، تنزیل قرآن کریم کا تنقیدی مطالعہ، خفیہ اور علانیہ تبلیغ کے ادوار کا تجزیہ، مظالم قریش کا تنقیدی تجزیہ، ہجرت حبشہ کا تحلیلی مطالعہ، سماجی مقاطعہ کا تحقیقی مطالعہ، نبوی سفر طائف کا تحقیقی مطالعہ، مکی مسلمانوں کی تعداد، اولین مسلمانوں کی قبائلی و خاندانی شناخت'' جیسے موضوعات پر اہل علم و تحقیق کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔

اس دوروزہ سمینار کی افتتاحی نشست ۱۷/ مارچ ساڑھے نو بجے دن میں منعقد ہوئی، آغاز حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی کی تلاوت سے ہوا، صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو کرنی تھی، ان کی آمد میں تاخیر کے باعث مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی، دارالمصنّفین کے سینئر رفیق اور سمینار کے کنوینر مولانا حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے

نظامت کے فرائض انجام دیے، انہوں نے پہلے ظہور قدسی کا وہ مشہور اقتباس پڑھ کر حاضرین کو سنایا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں تشریف آوری سے متعلق علامہ شبلی نعمانیؒ کے قلم سے ہے اور اردو ادب میں ایک شہ پارے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس سمینار کی غرض و غایت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی تفصیلات قدیم مآخذ سیرت میں موجود ہیں البتہ جس انداز اور تحقیق سے اس کے تجزیاتی مطالعہ کی ضرورت ہے وہ اب بھی باقی ہے، اسی احساس کے تحت سیرت نبویؐ کے اس حصہ کا انتخاب کیا گیا ہے تا کہ اس موضوع پر نئی تحقیقات و مباحث سامنے آئیں اور مکی زندگی کے وہ ابواب روشن ہوں جن کے بارے میں معلومات عموماً کم ہیں۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے ناظم پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور مندوبین و حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی کی ''سیرت النبیؐ'' اپنی زندگی کے سو سال مکمل کر رہی ہے مگر اس معیار و اسلوب کی کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر آج تک تصنیف نہ ہو سکی، انہوں نے کہا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لیے سیرت نبویؐ کا مطالعہ کریں، جس طرح قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لیے نورِ ہدایت ہے، اسی طرح حیاتِ طیبہ کا ایک ایک ورق ہمارے لیے مشعل راہ ہے، بالخصوص آنحضورؐ کی مکی زندگی کے صبر آزما حالات عہد حاضر کے مسلمانوں کے لیے بیش قیمت نمونہ ہیں جن کو سامنے رکھ کر مشکل ترین حالات میں سفر زندگی طے کیا جا سکتا ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان حالات کو جانیں جن میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تھا، مکی زندگی کا مطالعہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے، اس سے پہلے سیرت سمینار میں مصادر سیرت کا مطالعہ کیا گیا تھا، اس کے بعد منطقی طور پر اس موضوع پر سمینار کی تجویز ذہن میں آئی، اللہ سے دعا ہے کہ سمینار کامیابی سے ہمکنار ہو۔

اس کے بعد پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا، انہوں نے کہا کہ مکہ مکرمہ میں آپؐ کی پیدائش ابراہیمؑ خلیل اللہ کی دعا کے نتیجہ میں تھی، آپؐ کی بعثت و نبوت اور رسالت و دعوت کوئی خفیہ معاملہ نہ تھا بلکہ جدید زبان میں لکھا ہوا پیغام تھا جسے تمام اہل مکہ جانتے تھے، انہوں نے دعوت نبویؐ پر اکابر قریش کے ردعمل، تعذیب و عداوت، ابتدائی مشرکین مکہ، تعذیب و عداوت کا اصل دور، انصاف پسند اور مظالم روکنے والے اکابر قریش، مکی سورتوں

میں یہود ونصاریٰ کے غلط افکار کی تردید وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی اور حیات طیبہ کے مکی دور کے متعدد گوشوں کی طرف توجہ دلائی جن پر ابھی کام نہیں ہوسکا اور جن پر کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔نشست کے آخر میں ''آثارِ شبلی'' مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ''سرمایۂ امین'' (مجموعہ کلام) مرتبہ محمد مسلم اعظمی اور ''نوائے مشتاق'' (مجموعہ کلام) مرتبہ سہیل احمد اصلاحی کی رسم اجرا پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب اور مجلس صدارت کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

مقالات کی پہلی نشست اسی روز ۱۲ بجے شروع ہوئی، اس کی صدارت پروفیسر ظفر احمد صدیقی علی گڑھ اور نظامت ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے کی، اس میں کل ۷ مقالات پڑھے گئے، مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی اسکالر دارالمصنّفین نے قرآن مجید اور معراج کا پس منظر، ڈاکٹر جمشید احمد ندوی علی گڑھ نے مکی عہد میں تجارت نبوی سے متعلق ایک مخطوطہ، **الدرة الفريدة في تجارة النبوی وزواجه بالسيدة خديجة**، مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری (ممبئی) حلف الفضول (متحدہ قومیت کے پس منظر میں) ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی (دہلی) نے سرور کائناتؐ کی مکی زندگی کے صبر آزما مراحل، مولانا اشہد رفیق ندوی (علی گڑھ) نے ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کے مظالم''، مولانا نسیم ظہیر اصلاحی (مدرسۃ الاصلاح سرائمیر) نے ''مکی عہد میں نبی کریمؐ کی دعوتی سرگرمیاں'' اور ڈاکٹر سمیع اختر (علی گڑھ) نے ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی، بعض معاصر ادبا کی نظر میں'' کے عنوانات کے تحت پرمغز مقالات پیش کیے، آخر میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب نے ان مقالات پر عالمانہ اور تجزیاتی تبصرہ کیا۔

دوسری نشست بعد نماز مغرب شروع ہوئی، اس کی نظامت مولانا اشہد رفیق ندوی اور صدارت مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب (کیرالہ) نے کی، اس میں کل پانچ مقالے پیش کیے گئے، ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی (دہلی) نے ''دعوت اسلامی کا دور اول۔خفیہ دعوت''، ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے ''اولین مکی آیات اور سورتوں کا پیغام سماجی اور دینی تناظر میں''، مولانا اعجاز احمد قاسمی (استاذ جامعۃ الفلاح) نے ''قبائل عرب میں اشاعت اسلام اور اس کے ذرائع''، ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے ''مکی زندگی میں محمد عربیؐ کا اسوۂ دعوت اور امت مسلمہ''، مولانا نعیم الدین اصلاحی (جامعۃ الفلاح) نے ''اولین مکی سورتوں کا پیغام-سماجی اور دینی تناظر میں'' کے عنوان

سے پیش کیا۔اسی دوران ناظم ندوۃ العلماء، رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید واضح رشید ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے ۔مولانا محمد محمود حسن حسنی ندوی نے مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کا تحریری پیغام پڑھ کر حاضرین کو سنایا، مولانائے محترم نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ دارالمصنّفین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے زیر انتظام احیائے نو اور ترقی کے منازل طے کررہا ہے۔دارالمصنّفین اور ندوۃ العلما کے درمیان رشتوں کی وضاحت کی ضرورت نہیں ، ندوۃ العلما کو دارالمصنّفین سے الگ کرکے دیکھنا ان اداروں کی تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔انہوں نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر چوں کہ اس سیمینار کی نسبت سرور کائنات ﷺ سے ہے اس لیے اس میں شرکت کرنا میں نے اپنا فریضہ سمجھا ، اللہ تعالیٰ اس سیمینار کو بابرکت بنائے اور اس میں شریک مندوبین و حاضرین کو اجر عظیم سے نوازے ،مولانا سید محمد واضح رشید ندوی نے بھی اپنے خطاب میں پروفیسر ظلی اور ان کے رفقائے کار کی خدمات بالخصوص کیمپس کی صفائی ستھرائی اور چمن بندی کو سراہا اور فرمایا کہ علامہ شبلی کا ادارہ دارالمصنّفین اور ندوۃ العلما تو اُم بھائی کی طرح ہیں۔شبلی اکیڈمی کے احیائے نو کی ذمہ داری پروفیسر ظلی کے سر ہے اور مختصر مدت میں بلاشبہ انہوں نے اس ادارہ کو ترقی کے اعلیٰ مدارج کی جانب گامزن کیا ہے،سیرت سیمینار کا سلسلہ بھی اس کی اہم کڑی ہے۔ سیرت پر سیمینار ، کتابیں ، مقابلہ جاتی مقالہ نویسی کی جیسے پوری دنیا میں لہر سی چل پڑی ہے، علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبیؐ اور دارالمصنّفین کی دوسری کتابوں کو کم از کم انگریزی، عربی اور ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے ۔انہوں نے دارالمصنّفین کے زیر اہتمام ایک عالمی سیرت سمینار کی تجویز بھی پیش کی ۔اس کے بعد ناظم اجلاس نے اپنے ان معزز و محترم مہمانوں کے شکریہ کے لیے پروفیسر ظلی کو دعوت دی،انہوں نے فرمایا کہ ہم آپ کا شبلی اکیڈمی میں استقبال کرتے ہوئے انتہائی مسرت وخوشی محسوس کررہے ہیں اور صمیم قلب سے آپ حضرات کے شکرگذار اور سراپا سپاس ہیں۔آپ کی آمد کے لئے یہاں تقریباً سبھی حاضرین صبح سے چشم براہ تھے۔ہم توقع کرتے ہیں کہ اس ادارہ کی ترقی وفلاح و بہبود کو اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھیں گے، جہاں تک کتابوں کے ترجمہ کی اشاعت کی تجویز ہے ۔آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس منصوبہ کا

آغاز ہو چکا ہے۔اس کے بعد یہ قافلہ لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگیا۔اس کے بعد پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے تزویج حضرت خدیجہؓ- ایک مطالعہ کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔آخر میں صدر نشست مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب نے مقالات پر اپنی رائے ظاہر فرمائی۔

مقالات کی تیسری اور چوتھی نشست پروفیسر محمد نعمان خان ندوی صاحب کے زیر صدارت دوسرے دن ۱۸/ مارچ ۹/ بجے صبح سے شروع ہوئی، اس کی نظامت ڈاکٹر سمیع اختر نے کی، اس میں مولانا عمر اسلم اصلاحی مدرسۃ الاصلاح نے دعوت مکی کا مزاج واسلوب، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جامعی نے عہد مکی کے دعوتی ادوار - ایک تجزیاتی مطالعہ، کلیم صفات اصلاحی (دارالمصنّفین) نے انساب الاشراف میں مکی روایات سیرت کا جائزہ، ڈاکٹر عین الحق قاسمی (مئو) نے تبلیغ وارشاد کا آغاز وارتقا، مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب نے ہجرت حبشہ ایک نئی دنیا کی تلاش، پروفیسر محمد نعمان خان نے اپنا مقالہ ''حضور اکرم ﷺ کا سفر طائف''، ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی (علی گڑھ) نے سیرت طیبہ میں دار ارقم کی معنویت اور مولوی محمد صادق اصلاحی ندوی (اسکالر دارالمصنّفین) نے ''قرآن مجید کی تدوین وکتابت عہد مکی میں'' کے عنوان سے مقالات پیش کیے صدر اجلاس نے مقالات پر اپنے گراں قدر تاثرات پیش کیے۔

آخری نشست شکریہ کے لیے خاص تھی، اس کی صدارت پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی اور نظامت مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری صاحب نے کی، سیمینار سے متعلق تاثرات کے لئے سب سے پہلے پروفیسر ظفر احمد صدیقی کو بلایا گیا، انہوں نے فرمایا کہ حالات اور ضرورت کے تقاضے کے مطابق یہ سیمینار شبلی اکیڈمی میں منعقد کیا گیا۔کارکنان دارالمصنّفین اس کامیاب سیمینار پر مبارک باد کے مستحق ہیں، انہوں نے جس انداز سے مندوبین کی خدمت کی اور انہیں کسی قسم کی پریشانی کا احساس نہیں ہونے دیا یہ ان کے خلوص اور اعلیٰ مہمان نوازی کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سیمینار اس کی بارگاہ میں قبول ہو، اس کے بعد سید عبدالباری شبنم سبحانی نے فرمایا کہ اس ادارہ کی علمی وسیرتی خدمات اظہر من الشمس ہیں، سیرت سیمینار اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، ملت پر فرض ہے کہ ادارہ کو مضبوط بنائے اور اس کے مالی استحکام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے تاکہ ادارہ کے خدمت گزار مطمئن ہوکر اعلیٰ درجہ کی علمی خدمات انجام دیں۔اس قسم کے سیمینار کی

ضرورت تھی، جس کو اللہ نے اکیڈمی کے موجودہ ذمہ داروں سے پورا کرایا۔ پروفیسر محمد نعمان خان ندوی (دہلی) نے اپنے تاثرات میں کہا کہ سیرت سیمینار اللہ کا شکر ہے اپنے علمی و تحقیقی مقالات کے لحاظ سے بہت کامیاب ہے، اس موقع پر برادران وطن کی کمی کا احساس ہوا، آج کے ماحول میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ انہیں بھی آنحضور ﷺ کی سیرت کے گوشوں سے متعارف کرایا جائے تاکہ ان کے سامنے میں آنحضور ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق جو بدنما تصویر پیش کی جارہی ہے اس کا تدارک ہو سکے۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے دارالمصنفین کے کارکنوں کی ضیافت کا ذکر بڑی محبت سے کیا اور فرمایا کہ سیمینار اپنے مقصد میں بہت کامیاب ہے۔ بزرگوں کے مقابلہ میں نوجوان محققین نے سیمینار کی افادیت و معنویت میں اپنے علمی و تحقیقی مقالات سے چار چاند لگادیے ہیں۔ البتہ سیمینار کے متعلق جو عنوانات مقالہ نگاروں کو دیے گئے تھے اس کا پوری طرح احاطہ نہیں ہوسکا ہے اور ابھی اس میں مزید گنجایش ہے کہ محققین کے لئے عناوین مخصوص کر کے اسی موضوع پر ایک اور سیمینار کرایا جاسکتا ہے۔ آخر میں پروفیسر ظلی صاحب نے اپنے مہمانوں اور مندوبین و حاضرین اور تمام کارکنان دارالمصنفین کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ سیرت کا پیغام پہنچانا ہماری ذمہ داری اور فرائض منصبی میں داخل ہے، مگر اس فرض کی ادائیگی میں ہم سے کوتاہی ہورہی ہے، ہم کو خدا کے اس مؤاخذہ کا احساس ہونا چاہئے۔

اس موقع پر معززین شہر کے علاوہ اطراف کے متعدد مدارس کے اساتذہ وطلبہ، شبلی کالج کے پرنسپل انیس احمد خاں، منیجر مرزا محفوظ بیگ، ڈاکٹر شباب الدین، ڈاکٹر علاؤالدین، ڈاکٹر محی الدین آزاد، سہیل احمد اصلاحی، محمد مکرم، عبدالمعبود اصلاحی، ڈاکٹر جاوید اختر، ڈاکٹر امیر عالم، ڈاکٹر عمیر منظر وغیرہ، دارالمصنفین سے وابستہ افراد میں جناب عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری)، ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (رکن مجلس انتظامیہ و پبلی کیشن انچارج)، ڈاکٹر جاوید علی خاں (اعزازی رفیق)، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (اعزازی رفیق)، مولانا ڈاکٹر توقیر احمد ندوی، مرزا احمدان بیگ، مولوی سلیم جاوید اعظمی، حافظ سمیع الرحمٰن رشادی، ابوسعد فلاحی، حافظ محمد شریف محسنی، محمد ذاکر، مآب عالم فلاحی، ظریف الحسن، محمد ماجد، وصی الرحمٰن، ابورافع اور محمد زاہد و محمد شاہد نے اپنی اپنی ذمہ داریاں بہ حسن و خوبی انجام دیں۔

اخبار علمیہ

''خوش اخلاقی صحت انسانی کی بہتری کا اہم سبب''

لندن سے شائع ہونے والا عربی اخبار ''الحیاۃ'' نے امریکی جریدہ ''سائنس ڈیلی'' کے حوالہ سے لکھا ہے نیکی، حسن اخلاق اور رفاہی کاموں میں شمولیت انسان کی صحت میں بہتری اور اضافہ کا باعث بنتی ہے، یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا کے ماہر پرفیسروں پر مشتمل بورڈ نے یہ تحقیق پیش کی ہے، ماہرین نے مشترکہ تحقیق کا نام "Doing good is good for you" رکھا تھا، تحقیق کے دوران انہوں نے دسویں جماعت کے ۱۰۶ طلبا کے دو گروپ بنا کر ایک کو حسن اخلاق اور رفاہی کاموں اور دوسرے کو والدین کے عدم اطاعت اور فواحش و منکرات کے لحاظ سے تقسیم کیا تھا، دس ہفتوں تک ان کی طبی حالت کا معائنہ اور ان کے کاموں کا ان کی جسمانی صحت پر مرتب اثرات کا بہ غور مطالعہ کیا جاتا رہا، حیران کن نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اچھے کام والے طلبہ کا انفشار خون (بلڈ پریشر)، شوگر اور کولیسٹرول پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور متوازن اور بدعمل طلبہ میں ان بیماریوں میں ملوث ہونے کی شرح زیادہ پائی گئی، ماہرین نے تحقیق میں ایک ہزار سے زیادہ دل کے مریضوں کی زندگیوں کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، معلوم ہوا بدکاروں کے امراض قلب میں مبتلا ہونے کا امکان عام افراد سے کہیں زیادہ ہے۔

''برطانیہ کی تیسری مقبول ترین زبان''

گذشتہ دسمبر میں مردم شماری پر مشتمل تازہ رپورٹ برطانوی قومی شماریات نے شائع کی تھی جس میں اسلام کو ملک کا دوسرا سب سے بڑا مذہب قرار دیا گیا تھا، اب وی او اے ویب سائٹ پر اسی ادارے کی شائع رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پنجابی برطانیہ کی تیسری مقبول ترین زبان ہے، رپورٹ کے مطابق برطانیہ کے ۴۰ لاکھ یعنی ۸ فیصد لوگ مادری زبان انگریزی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی بولتے ہیں، ملک کی ۲۰ مقبول ترین زبانوں کی فہرست میں انگریزی اور پولش کے بعد سب سے بڑی اور مقبول زبان پنجابی ہے جبکہ اردو کو چوتھی، گجراتی کو چھٹی اور عربی کو ساتویں بڑی زبان ہونے کا اعزاز وافتخار حاصل ہے، مجموعی طور پر پنجابی بولنے والوں کی تعداد ۲ لاکھ ۷۳ ہزار

اور اردو استعمال کرنے والوں کی تعداد ۲ لاکھ ۶۹ ہزار ہے، ۱ لاکھ ۴۰ ہزار افراد برطانیہ میں انگریزی سے بالکل نابلد، ۷ لاکھ ۶۰ ہزار انگریزی کی تھوڑی بہت شد بد رکھنے والے اور ۱۰ لاکھ ۶۰ ہزار اچھی طرح بات چیت کرنے والے ہیں اور انگریزی پر مکمل عبور رکھنے والوں کی تعداد ۱۰ لاکھ ۷۰ ہزار ہے۔

''دوران تربیت بچوں سے جھوٹ بولنے والے والدین''

کیلیفورنیا یونیورسٹی، امریکہ، زیجنگ نیشنل یونیورسٹی چین اور یونیورسٹی آف کینیڈا کے شعبہ نفسیات کے ماہرین نے دوسو خاندانوں کے ساتھ گفتگو پر مشتمل ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ چین اور امریکہ میں بچوں کی پرورش و پرداخت کے دوران ان کا رویہ تبدیل کرنے کے لیے بیشتر والدین جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں، اکثر دھمکی دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے یہ حرکت کی تو وہ انہیں اپنے سے الگ کردیں گے، کھلونے کی ضد پر انہیں دلانے کا جھوٹا وعدہ کر لیتے ہیں، شرارت پر انہیں پولیس کے حوالہ کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے، دکان پر بچوں سے جھوٹ بولا جاتا ہے کہ پیسے نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ، اس قسم کے بہت سے جھوٹ محققین نے اپنی تحقیق میں جمع کرکے یہ نتیجہ تحریر کیا ہے کہ اس رویہ سے بڑے ہونے پر بچوں اور والدین کے درمیان تعلقات پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان میں جھوٹ اور بہانہ بازی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہ تحقیق انٹرنیشنل جرنل آف سائیکالوجی میں شائع ہوئی ہے۔

''پاندان کے استعمال کی ابتدا''

لگزے انڈیا نامی ویب سائٹ میں پاندان کے متعلق معلومات میں دلچسپ طور پر کچھ شواہد ۲۶۰۰ قبل مسیح ہڑپہ تہذیب کے آثار میں بھی ملتے ہیں، اس عہد میں پاندان لکڑی کے ہوتے تھے، دھات سے بنائے گئے پاندانوں کے استعمال کی ابتدا یانک او نامی برمی ویب سائٹ کے مطابق برما (میانمار) میں ۵ سو قبل مسیح ہوئی، بدھ بھکشو، نزلے اور زکام سے بچنے اور منھ کی صفائی کے لیے پان کی تازہ کونپلیں چباتے تھے، پھر یہ عادت عام رواج کی شکل اختیار کر گئی، اس کے لیے انہوں نے کانسی کے پاندان ایجاد کیے، جنہیں مقامی زبان میں Knu-it کہا جاتا تھا۔

''محدث دکن کی تصنیفات کے انگریزی تراجم کا منصوبہ''

دکن کے مشہور محدث صاحب نور المصابیح حضرت ابو الحسنات عبد اللہ شاہؒ نے ۲۹ کتابیں تالیف کی تھیں، ان میں بیشتر آسان اور عام فہم اردو زبان میں ہیں، نئی نسل سے ان کو روشناس کرانے کے لیے ان کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا کا منصوبہ بنایا گیا ہے، ان کی ڈیجیٹلائزیشن اور ملک و بیرون ملک میں محفوظ ان کی تصنیفات کی حصولیابی کا کام ابو الحسنات اسلامک ریسرچ سنٹر کے زیر اہتمام جاری ہے، اس کی اطلاع مولانا سید عطاء اللہ شاہ نے حیدرآباد میں پریس کانفرنس کے ذریعہ دی ہے۔

''ہندی کو فروغ مل رہا ہے''

''دی پیپل لینگویسٹک سروے آف انڈیا'' کے مطابق ہندی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے نتیجہ ہندی سے منسلک دوسری عوامی بولیاں ختم ہو رہی ہیں، رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندی کو انگریزی سے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ دونوں زبانوں کے بولنے والوں کے معاشرہ پر یکساں اثرات مرتب ہوتے ہیں، پچاس سال قبل جہاں پنجابی اثرات سے متاثر ہندی زبان بولنے اور سمجھنے والوں کا غلبہ تھا، اب اتر پردیش اور بہار سے متاثر ہندی زبانوں کے استعمال کا رجحان بڑھ گیا ہے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد ایک تہائی زبانیں گوشۂ گمنامی میں خاموش ہو کر رہ گئی ہیں۔

ک، ص اصلاحی

ادبیات

ڈاکٹر سید امین اشرف مرحوم
سابق استاد شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جناب وارث ریاضی

چل بسا دنیا سے اک تلمیذ رب مہرباں
شادماں ، خنداں ، غزل خواں سوے گل زار جناں

جس کے غم میں مرکز(۱) رشد و ہدیٰ ہے سوگوار
محفل شعر و ادب سے غم کا اٹھتا ہے دھواں

اے امیں اشرف ! کہاں نظروں سے اوجھل ہوگیا؟
ڈھونڈنے سے بھی کہیں ملتا نہیں تیرا نشاں

یاد آتا ہے مجھے اخلاص سے ملنا تیرا
وہ تری ذرہ نوازی ، تیرا لطف بے کراں

میٹھے لہجے میں وہ تیرے بات کرنے کی ادا
خوب صورت گفتگو ، تسنیم میں شستہ زباں

تیری ہستی تھی حسیں اخلاق کی آئینہ دار
حسن سیرت تیرے رخسار متانت سے عیاں

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔

ہوگئیں سونی غزل کی محفلیں تیرے بغیر
اے غزل کی آبرو ، علم و ادب کا ترجماں

اے بہار شعر و حکمت ، صاحب فکر و نظر
محرم راز غزل ، اے شاعر رنگیں بیاں

مل نہیں سکتا کسی کو ، پا نہیں سکتا کوئی
تیرا اسلوب تغزل ، تیرا انداز بیاں

تیری فرقت میں حزیں اسلوب (۲) سا بالغ نظر
محو غم ہے شمس رحماں(۳) سا ادیب نکتہ داں

تیری رحلت پر وحید اشرف (۴) بہت مغموم ہیں
چشم سید (۵) ، دیدۂ بابر (۶) سے اشک غم رواں

از نگاہ ام ہانی (۷) دفعتاً غائب شدی
اے کہ تو شامل شدی در کاروان رفتگاں

سال رحلت آں امین اشرف والا تبار
یک ہزار و چار صد بعد انضمام سی و چار

۱۴۳۴ھ

---

(۱) خانقاہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف۔ (۲) پروفیسر اسلوب احمد انصاری۔ (۳) شمس الرحمٰن فاروقی۔ (۴) ڈاکٹر سید وحید اشرف (مرحوم کے چھوٹے بھائی)۔ (۵) سید اشرف ریٹائرڈ جونیر انجینئر (مرحوم کے چھوٹے بھائی)۔ (۶) عالی جناب بابر علی صاحب، سب جج ضلع اناؤ (یوپی) (مرحوم کے رشتے دار)۔ (۷) مرحوم کی بیگم صاحبہ۔

مطبوعات جدیدہ

لمحوں کا کارواں: از ڈاکٹر محمد محسن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۱۶، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: نرالی دنیا پبلی کیشنز A-358 بازار، دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی نمبر ۲ اور دہلی و پٹنہ کے دوسرے اہم مکتبے۔

زندگی لمحوں کے مسلسل سفر کا نام ہے، ہر لمحہ جدا وجود کے ساتھ گزرے اور آنے والے لمحوں سے جڑا بھی ہو، دیکھا جائے تو ہر شخص لمحوں کے کارواں میں شریک ہے، کارواں یکساں ہے لیکن ہر مسافر کے تجربات میں یکسانی نہیں، زندگی کا یہی سفر ہے جس کی رفتار اور سمت کی اس بوقلمونی کو نہ سمجھا گیا نہ سمجھایا جاسکتا ہے، زیر نظر کتاب بھی اس معمہ کو سمجھنے یا سمجھانے کی اسی روایت کا حصہ ہے جس سے اردو ادب کا سرمایہ وقیع ہوتا آیا ہے، مصنف ۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۹۹ء میں اس حیات مستعار سے دستبردار ہوئے، گذشتہ صدی میں بہار کے ممتاز ترین مسلمانوں کی اگر مختصر ترین فہرست بھی تیار کی جائے تو اس میں ان کے نام کی شمولیت وجہ جواز پیش کرتی نظر آئے گی، فلسفہ خصوصاً فلسفۂ نفسیات ان کا خاص موضوع رہا اور درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں ان کے افکار کی بنیاد یہی علم نفسیات ہے، اردو کے علاوہ انگریزی میں انہوں نے متعدد کتابیں اور بیسیوں اہم مقالے لکھے، موضوع اور خدمات کے لحاظ سے مسلمانوں میں ان جیسی مشکل سے کوئی اور شخصیت نظر آتی ہے۔ اور یہی بات اس خودنوشت کے متعلق کہی جاسکتی ہے کہ زندگی کے نفسیاتی مطالعہ و مشاہدہ میں یہ منفرد ہے، کتاب زندگی کے بکھرے اوراق وہ بھی ایک صدی کی داستان پر محیط ان کو جمع و مرتب کرنے کا عمل بھی اسی وقت تکمیل کے قریب ہوا جب خود مصنف دنیا کی اس زندگی کے بالکل آخری مرحلے میں تھے اور اس احساس کے ساتھ جینے کا سلیقہ برتا تھا کہ ہمیشہ ان کی ذات ہی ان کے مطالعہ کا مرکز رہی، یعنی خود احتسابی ان کی لت یا عادت یا فطرت میں رچ بس چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ ماضی سے رشتے کا بیان ہو، خاندان کا جاگیردارانہ ماحول ہو، یوروپ کی تعلیم ہو، ہندوستان کے اعلیٰ مناصب ہوں، سب کے بیان میں خود احتسابی کا سخت عمل، خود اور خود کے ماحول پر تیشہ زن رہا، انگریزوں کے زمانہ میں اعلیٰ عہدے داروں میں رشوت کی گرم بازاری کا

ذکر کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ انگریزوں نے صرف رشوت ستانی کو ہی فروغ نہیں دیا ، ہندوستانیوں کی اخلاقی گراوٹ کے لیے ایک منصوبہ بند طبقاتی نظام مراتب رائج کیا، جس سے ہر نچلے طبقے پر اس سے اوپر والے طبقے کی حکومت قائم ہوگئی، انگریز تو چلے گئے لیکن ان کے طریقہ کار کی تخریب کاری آج بھی جان کا روگ بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح انگریزوں کے نظام تعلیم کے متعلق لکھا کہ انگریزوں نے اس ملک میں جو نظام تعلیم رائج کیا وہ ان کے نظام تعلیم سے بالکل مختلف تھا، انہوں نے کردار سازی کو اس میں کوئی جگہ نہیں دی ، دماغی صلاحیتوں اور ہنرمندی کی نشو ونما کے بجائے اس تعلیم کا بنیادی مقصد، فطری صلاحیتوں پر پانی پھیرنا اور ساری تہذیبی وثقافتی روایتوں سے کٹ کر ایسے سانچے میں ڈھل جانا تھا جو سامراجی اقتدار کے مستقل قیام کا ضامن ہوسکے۔ انہوں نے تجزیاتی انداز سے بتایا کہ فرض شناسی ، احساس ذمہ داری، خود اعتمادی، انضباط ذات اور کئی اسی قسم کی اخلاقی قدریں، برطانیہ میں شخصیت کے تعمیری اجزائے ترکیبی میں داخل تھیں، لیکن ہندوستان میں ان کے طریقہ تعلیم نے ان ہی پر قدغن لگائی۔ اس قسم کے گہرے اور عملی تجزیے، خودنوشت ہی نہیں تاریخ کے نوشتوں سے ہم آہنگ کرتے نظر آتے ہیں، خاندان اور برادری کا ذکر شمالی ہند کے سوانح نگاروں کے لیے گویا فرض عین ہے، اس کتاب میں بھی یہ ذکر تفصیل سے ہے اور یہ کہہ کر ہے کہ اسلام نے جس طبقاتی نظام کی بیخ کنی کے لیے سب سے پہلے قدم اٹھایا تھا، رفتہ رفتہ مسلمانوں کے معاشرے میں بھی اس کی عمل داری ہوگئی ، اس کے بعد آزادی سے پہلے بہار کے مسلمانوں کی سماجی زندگی کی اونچ نیچ کی تصویر بڑی عبرت انگیز ہے اور اس سے بڑھ کر زمینداری کے واقعات ہیں جن سے نتیجہ یہی نکالا گیا کہ ''مظلوموں کی آہ وفریاد کی بازگشت کارخانۂ قدرت کی سست رفتاری پر تازیانہ کا کام کرنے لگتی ہے، اس کے ڈھیلے ڈھالے کل پرزے برق آسا سریع العقاب ہوجاتے ہیں''۔ مصنف کے افسانوں، خاکوں، مضامین اور اشعار کا بیان بھی بہت دلچسپ ہے، خصوصاً منٹو کے متعلق اپنی ایک کتاب کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ''اس نے منٹو کے متعلق عوامی تصورات میں ایک انقلاب برپا کردیا''۔ بظاہر یہ ادعائی پیرایہ ہے لیکن اردو کے بعض نامور نقادوں نے جس طرح اس کتاب کا تجزیہ کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض دعوی نہیں، حقیقت بھی ہے، پروفیسر سید حسن اور کلیم الدین احمد پر ان کے خاکے ان کی قوت مشاہدہ کی بڑی خوبصورت

تصویر ہیں، کتاب میں بہت کچھ ہے اور سب کچھ اعلیٰ درجہ کا ہے، حسرت موہانی، قاضی عبدالودود کے نفسیاتی تجزیے ہوں یا احباب کے، علمی و ادبی اداروں اور رفاہ عام تنظیموں کی بات ہو، آپ بیتی میں جگ بیتی کے دھارے ملتے رہتے ہیں اور زندگی کی لہروں کو بڑھاتے جاتے ہیں، زندگی کا یہ سفر کہیں اپنی ذات کے متعلق رک کر کچھ سوچنے کی مہلت دیتا ہے تو کہیں اس راہ میں حادثات کی بوالعجبی زندگی کے ماوراء، کچھ اور ہونے کا احساس دلاتی ہے، مصنف نے حرمین شریفین کی زیارت کی، زندگی کی شام جب نورانی ہو جائے تو آفتاب کے ڈھلنے کا کیا غم، خاتمہ بالخیر کسی بھی داستان کی کامیابی کا ضامن ہے، لمحوں کے اس کارواں کا مطالعہ واقعی زندگی کی شاہراہوں سے صحیح معنوں میں متعارف کراتا ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیوں کا ذکر ضروری نہیں، تاہم جب یہ زیادہ ہو جائیں تو حرف شکوہ لب پر آ ہی جاتا ہے، کہیں کہیں حافظہ سے بھی سہو ہوا ہے جیسے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کو ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' کا مصنف بتایا گیا ہے، یادداشت یقیناً ایک اہم ماخذ ہے لیکن یہ اعتراف بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ حافظے کی کارگذاری دم تحریر کے تھوڑے ہی عرصہ تک قابل اعتماد ہو سکتی ہے۔ اردو کی خودنوشت سوانح نگاری میں چند بہترین کتابوں میں شامل کیے جانے کے لائق اس کتاب کو فاضل سوانح نگار کے سعادت مند فرزند جناب آفتاب محسن نے شائع کر کے یقیناً احسان بالوالدین کی روشنی بکھیر دی ہے۔

وادی نیل میں بیس دن: از جناب انیس چشتی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۰، قیمت ۲۲۵ روپے، پتہ: مرزا ورلڈ بک ہاؤس، جنسی روڈ، قیصر کالونی اورنگ آباد، ۴۳۱۰۰۱، مہاراشٹر۔

اس سفرنامہ کا داستان گو ابن بطوطہ تو نہیں، لیکن مدت سے قطع نظر مسافت کے پیمانوں کے لحاظ سے اپنے پیش رو سے کم بھی نہیں، فرق اگر ہے تو انداز سفر کا، جس کی ایک جھلک کا اندازہ ٹائٹل کی اس پہلی عبارت سے ہو جاتا ہے کہ ''سفر کرنا اور مسجد میں باجماعت نماز پڑھنا صحت کی علامت ہے'' مسافر کی سمت اور نیت جب اتنی درست ہو تو سفر کے ہر منظر کے سحر مستمر میں بدلنے پر حیرت نہیں ہونی چاہیے، کتاب کے عنوان سے ہی منزل مقصود کا پتہ آسان ہو جاتا ہے، **الیس لی ملک مصر** ! یوسفؑ، موسیٰؑ و ہارونؑ، فرعون و ہامان و قارون، سحرہ و سامری، طور کا کوہ اور سینا کی وادی، مقوقس و ہرقل، اسکندریہ و قاہرہ، شافعی و مزنی، طہٰ وطنطاوی اور قاری باسط و ام کلثوم، کپاس و زیتون کیسے کیسے منظروں کے سرنامے، ہند کے ابن بطوطہ کی نسبت قلندری نہیں چشتی ہے پھر بھی

مصر کے ان عنوانوں سے ان کی دنیائے تصور خوابناک ہوئی، خوفناک بھی ہونی چاہیے تھی لیکن خوف وخواب میں وجہ ترجیح بہرحال خوبی خواب کو ہے، اسی کا مثبت نتیجہ تھا کہ انہوں نے صحرائے مصر کو دشت امکاں کا نقش پایا اور اس بازیافت کا سبب رابطہ ادب اسلامی کا ایک سمینار بنا، جس نے **ادخلوا مصر ان شاء الله آمنين** کی معنویت ان پر برکت کی شکل میں ظاہر کردی اور پھر قلوپطرہ کے اسرار ہوں یا فرعون کے سلسلہ ہائے انکار و اقرار ہوں، ہمارے سیاح کے دل کی آنکھیں وا ہوگئیں، انہوں نے دیکھا کہ مصریوں کے اعصاب پر فرعون کو کیسے سوار کرایا گیا، ممیوں کی شکل میں ایک قدیم ترین تہذیب کے کفن کو بوسیدگی سے کیوں بچایا گیا، اہراموں اور ابوالہول کی رفعتوں، وسعتوں اور گہرائیوں میں بقا وفنا کی کتنی حقیقتیں بکھری ہوئی ہیں، سیاح، تاریخ، تہذیب، تعلیم، سیاست کا آشنا ہی نہیں شناسا بھی ہے، اردو اس کے دل کی زبان ہے اور اسلامی ادب اس کی روح کا ہم زبان ہے، اس لیے مصر کی فضاؤں میں وہ ہندوستان کو محسوس کرتا رہا، اقبال اور مولانا علی میاں کے کلام و پیام کی بازگشت احساس دلاتی رہی کہ جانے اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں، اردو کے سفرناموں میں یہ کتاب اس لیے بھی یاد رکھی جائے گی کہ اس میں مصر کے اہرام سے وہاں کی ثرید اور یوسف وفرعون سے ناصر وصلاح الدین تک، نیل سے سوئز تک وہ منظرنامہ ہے جس کے لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بہ نگاہ مجنوں باید دید۔ اسلوب اتنا ہی بے ساختہ برجستہ اور پرلطف ہے جتنا صاحب اسلوب کی شخصیت، مولانا سید محمد رابع ندوی نے مقدمہ میں بالکل درست یہ خیال ظاہر فرمایا کہ باتیں دلچسپ ہوں اور تحریر بھی دلچسپ ہو تو مضمون دوآتشہ ہوجاتا ہے۔

لکھنؤ، کچھ ماضی کچھ حال: از جناب رضوان احمد فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: دانش محل، امین آباد، لکھنؤ اور جناب عارف علی انصاری، بک سیلر، لطیف مارکیٹ، خیرآباد، سیتاپور یوپی اور لکھنؤ کے دیگر مکتبے۔

مولانا عبدالحلیم شرر کا مورخانہ ذوق تھا جس نے لکھنؤ کے ماضی کو تاریخ کے رنگ میں پیش کیا، زیرنظر کتاب کا موضوع بھی لکھنؤ ہے لیکن یہ ذاتی محسوسات کی بنیاد پر ہے، محسوسات کی دنیا کا تعلق ماضی سے بھی ہے اور حال سے بھی، پھر اس میں احساسات کو اختصار کے دائرہ میں رکھنے کی بھی شعوری کوشش ہے اور اس کی وجہ بھی ہے کہ اصلاً یہ ایک مضمون تھا جو لکھنؤ کے ایک

روزنامہ آگ کی نذر کیا گیا تھا۔لیکن آگ کی روشنی اور حرارت کچھ اس درجہ کی تھی کہ دل کو کئی اور کہانیاں یاد آنے لگیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون نے کتاب کا قالب اختیار کرلیا اور اب یہ ایک زیادہ دلچسپ داستان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، جس میں لکھنؤ کے بازار، پرانی حویلیاں اور جدید عمارتیں تو نظر نہیں آتیں لیکن جن کے دم سے ان سب میں رونق ہے اور خود صاحب کتاب بھی جس کا حصہ ہیں، وہ سب اس میں لکھنؤ کی اصل تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہیں اور لکھنؤ کی اصل تصویر یا شناخت ہے کیا؟ جواب صرف ایک ہے، منفرد تہذیب، منفرد ادب اور زندگی گزارنے کا ایک منفرد سلیقہ۔کتاب میں قریب ۲۰۰ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور سماجی لحاظ سے نمایاں لوگوں کا ذکر خواہ وہ کتنا ہی مختصر اور تشنہ ہو، ایک خوبصورت مرقع تو تیار ہی کرسکتا ہے، بزرگ صحافی جناب حفیظ نعمانی نے کسی تیز رفتار ٹرین سے باہر کے حسین مناظر سے تشبیہ دی کہ یہ سارے منظر چشم زدن میں گزرتے جاتے ہیں، حقیقت کچھ ایسی ہی ہے لیکن حسن و حیرت کی یہ لمحاتی کیفیت کیا کم ہے، رواں تبصرہ کا اپنا جدا لطف ہے، صحیح کہا گیا کہ لکھنؤ میں اب نواب نہیں، خوش حالیوں اور خوش خیالیوں کو مسائل کی تپش نے جھلسا دیا لیکن جو ہے اس میں تپش بھی ہے اور گداز بھی، کتنے نام آتے ہیں اور کیسے کام دکھا جاتے ہیں، چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہنے کا ہنر لکھنؤ کی پہچان ہے، بشیر فاروقی کا ذکر ہے کہ شاعری، ملازمت اور خانگی امور میں توازن کو سدا برقرار رکھا اسی لیے وہ ان تینوں خانوں میں کامیاب و کامران ہے، رئیس انصاری نے تدبیر سے تقدیر بنائی، عمر انصاری نے کئی ضخیم کتابیں لکھیں حد یہ ہے کہ اپنی حیات میں اپنی کلیات شائع کرنے میں کامیاب رہے، عادل لکھنوی کا زیادہ تر کلام شاگردوں کی نذر ہوا یا بے عملیوں کی بھینٹ چڑھا، سلمان عباسی کو بنت عنب اور بنت حوا کے شوق نے معتبریت سے دور کردیا، عرفان لکھنوی کے ترنم میں توازن ہے، اس لیے سماعت پر گراں نہیں گزرتا، مولانا شمس تبریز بہت سے کام اپنے نام سے کرسکتے تھے مگر انہیں دوسروں کو بنانے سنوارنے سے فرصت کب تھی؟ برکھا رانی پر یہ بات صادق آتی ہے کہ حسن اور ترنم کی زیادہ عمر نہیں ہوتی، ایک وقت تھا وہ اسٹیج کی زینت تھیں، ہر جگہ چھائی بچھائی تھیں، لکھنؤ والوں کی زبان سند ہوتی ہے ایسے میں تخالیق جیسے لفظ کی تکرار نامانوس لگتی ہے۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

(۱) **ادبیات فارسی در دولت سلطنت**: ماریہ بلقیس، مسلم ایجوکیشنل پریس، بنی اسرائیلان علی گڑھ۔
قیمت: درج نہیں

(۲) **ادبیات ملفوظ وصوفیای ہند**: ماریہ بلقیس، مسلم ایجوکیشنل پریس، بنی اسرائیلان علی گڑھ۔
قیمت: درج نہیں

(۳) **انقلاب آنے کو ہے**: آصف شمسی، انجمن زندہ دلان سہارن پور۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

(۴) **پروفیسر نذیر احمد، در نظر دانش مندان**: پروفیسر ماریہ بلقیس، شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

(۵) **تجلیات قرآن**: سید جلال الدین عمری، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلی شرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

(۶) **جذباتی اور جدلیاتی شعور ادب، تنقیدی مضامین**: محمود شیخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ قیمت: ۹۵ روپے

(۷) **سرمایہ امین**: مسلم اعظمی، نشان امین، ۱۵-دلسنگار، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۱۱۰ روپے

(۸) **عکس واثر (مجموعہ مضامین)**: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ/ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

(۹) **غزل تنقید کے چند نمونے**: اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس، عبد القادر مارکیٹ، جیل روڈ، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

(۱۰) **قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور تفسیر مظہری کا تعارف**: ڈاکٹر رضوان الدین خان، یونیورسل بک ہاؤس، ۳۰/ عبد القادر مارکیٹ، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

(۱۱) **مشعل راہ**: ابوالفیض عزم سہریاوی، البدر بک سنٹر، سرائے میر اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

(۱۲) **منشی نول کشور حیات وخدمات**: سید مصطفیٰ حسین نقوی، مرکز تحقیقات فارسی، رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی، ایران، دہلی نو۔ قیمت درج نہیں

(۱۳) **مکاتیب سنائی**: مرتب نذیر احمد، کتاب خانہ ملی ایران۔ قیمت درج نہیں

(۱۴) **نقوش دوام**: محمد ساجد کھنجاوری قاسمی، جامعہ اشرف العلوم رشیدی، گنگوہ سہارن پور یوپی۔
قیمت: ۲۰۰ روپے